دانا صراہ
مرثیۂ ناصر الملت
ناشر- سید نوروز حسین، سیکریٹری انجمن جعفریہ قصبہ سنتھل ضلع بریلی

وانا صراہ
مرثیۂ ناصر الملۃ
از
ناشر: سید نوروز حسین، سکریٹری انجمن جعفریہ قصبہ سنبھل ضلع بریلی

وا ناصراه

مرثیۂ ناصر الملت

از شاعر آل محمدؐ

جناب مولوی سید قائم رضا صاحب نسیم امروہوی

مع مقدمہ و مع حاشیہ

از جناب خواجہ اسد صاحب — از جناب مولوی سید منیر حسن صاحب

ناشر

سید نوروز حسین سکریٹری انجمن جعفریہ قصبہ سنبھل ضلع بریلی

سنہ ۱۹۴۳ء
۱۳۶۲ھ

ملنے کا پتہ

۱- سکریٹری انجمن جعفریہ قصبہ سنبھل ضلع بریلی
۲- ادارۂ اردو۔ نرولی ہاؤس ۱۴/۱۴ - خیالی گنج۔ لکھنؤ
۳- اخبار سرفراز لکھنؤ (اور دوسرے قومی ادارے)

باہتمام

حاجی محمد اسمٰعیل

ادبی پریس لاٹوش روڈ لکھنؤ طبع شد
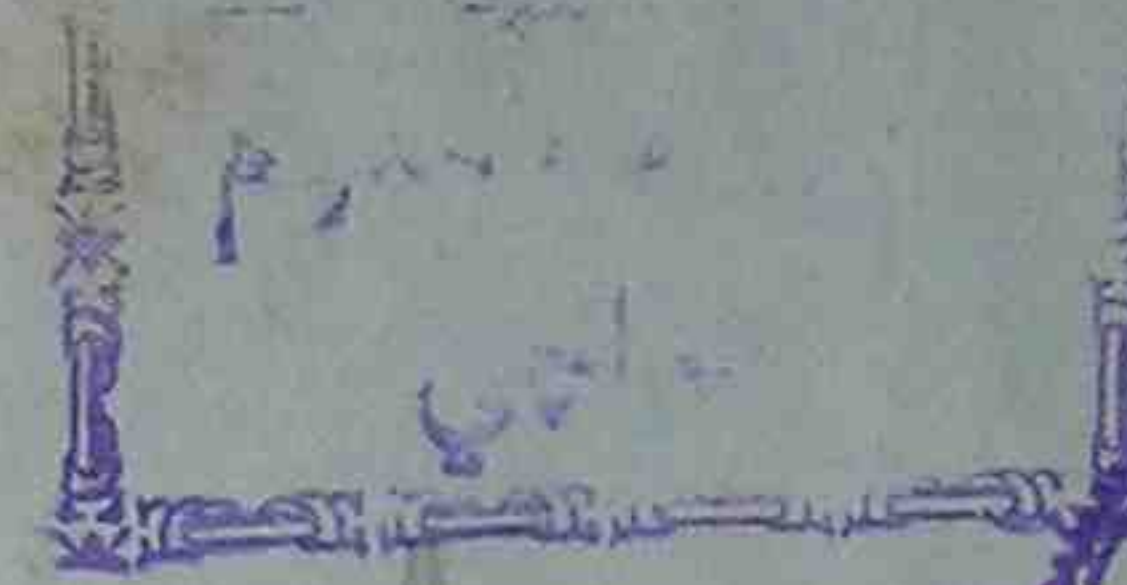
باسمہ

جناب قائم رضا صاحب نسیم[۱] امروہوی کا نام دنیائے ادب و شاعری میں محتاج تعارف نہیں۔ آپ کا تعلق امروہہ کے اُس خانوادۂ بزرگ سے ہے جس سے سرکار نجم العلماء مرحوم اعلی اللہ مقامہ کا تعلق تھا اور آپ اُن کے عزیز قریب ہیں۔ آپ کی اکثر نظمیں اور مرثیے ملک میں بیحد مقبول ہو چکے ہیں، بلکہ اس حد تک اپنے اعتبار کا سکہ جما چکے ہیں کہ کاغذ کی اس نایابی و گرانی کے زمانے میں اُن پر تبصرہ لکھنا گراں معلوم ہو رہا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میرا جناب نسیم امروہوی کی تصنیفات اور شاعری کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل حاصل کے سوا کچھ نہیں ہے۔ رنگ ود بو محتاج تعریف و تعارف نہیں لیکن اس احساس کے بعد بھی میں موصوف کے اس مرثیہ کو دیکھ کر اور سُن کر جو موصوف نے سرکار صدر المحققین ناصر الملۃ والدین مولانا سید ناصر حسین صاحب اعلی اللہ مقامہ کی وفات پر سپرد قلم کیا ہے مجبور ہوں کہ اپنے ناچیز خیالات کا اظہار کروں اور جناب نسیم کا نہیں بلکہ اُن کی اس کامیاب ترین کوشش کا دنیائے ادب و شاعری سے تعارف کراؤں۔ جناب نسیم کے اس مرثیہ کا مقدمہ لکھنے کے وقت مجھے اس سے کوئی بحث نہیں کہ مرثیہ گوئی کی ابتدا کب سے ہوئی، کہاں سے ہوئی اور اس نے کیا کیا تدریجی ترقیاں کیں ——— اس مضمون میں مجھے مصنف کے کلام کا متقدمین یا شعراء موجودہ کے مراثی سے کوئی مقابلہ بھی نہیں کرنا ہے۔

---

[۱] نبیرۂ فرزدق ہند حضرت شمیم امروہوی شاعر دربار ریاست رامپور ۱۲

اس لیے کہ "ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است" کے مصداق ہر شاعر اور مرثیہ گو نے تامقدور گلستانِ سخن کی گلچینی کرکے اپنے مذاق، سلیقے اور وسعتِ دامن کے مطابق کچھ نہ کچھ گلہائے مراد حاصل کیے ہیں۔

دنیا واقف ہے کہ مرثیہ کا رنگ اُس کے ابتدائی دور میں بالکل ہی جداگانہ تھا۔ مرثیہ کا اساس درد وغم کے جذبات پر رکھا جاتا تھا اور بس۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ ہوتا وہ یہ کہ مرنے والے کے محاسنِ اوصاف کو مبالغہ کے ساتھ ظاہر کرکے یہ سمجھا دیا جاتا کہ مرنے والے کی اس موت سے ان تمام اوصاف ہی کا خاتمہ ہوگیا۔ اس دور میں مرثیے کا دامن واقعہ نگاری، سراپا، گھوڑا، تلوار اور دیگر اسلحہ جنگ کے اوصاف —— سیرت نگاری مناظرِ قدرت اور رزم و بزم کی تصویر کشی سے خالی تھا۔ میر ضمیر نے مرثیے کو موجودہ طرز کا خلعت پہنایا اور اس میں وہ جدتیں پیدا کیں جو بعد کے اور آج کے مرثیوں کا نہ صرف موضوع ہیں بلکہ روح ہیں۔

میر انیس اور مرزا دبیر نے اس آئینہ کو اور جِلا دی۔ یہاں تک کہ ان بزرگوں کے دور میں یہ مسلّم ہوگیا کہ اب مرثیہ اس منزل پر پہونچ گیا ہے جس سے اُس کو آگے بڑھانا اگر محال نہیں تو دشوار تر ضرور ہے۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ مرثیہ گوئی اُن حدوں پر جو اس کے لیے میر و میرزا کے عہد میں معین ہوچکی تھیں ختم ہوگئی اور اب اُن حدود کے اندر رہ کر ایک سنت کہن کو ضرور تازہ رکھا جاسکتا ہے لیکن اُس ترقی کے بعد اب کوئی دوسری معراج مرثیہ کے لیے ناممکن ہے۔ بافہم ہیں اور خوش فہم

ہیں وہ حضرات جنھوں نے ذوقِ سلیم و احساسِ صحیح سے کام لیکر اپنی مرثیہ گوئی کا راستہ علیحدہ کرنے کی کوشش کی اور اپنی جد و جہد کے لیے نئے میدان نکالے۔ زیرِ نظر مرثیہ کا بھی عنوان ایسا ہی ہے اور جناب نسیم کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ انھوں نے سابقہ دور کے مرثیوں کی نقالی پسند نہیں فرمائی بلکہ مرثیہ گوئی کے لیے ایک نیا راستہ نکالا —— یہ صحیح ہے کہ اس مرثیہ میں جناب نسیم کو رزمیہ شاعری کے جوہر دکھانے کا موقع نہ تھا اور نہ اس کا موقع کہ آپ گھوڑے تلوار اور اسلحہ جنگ کے اوصاف لکھتے۔ اس مرثیے میں نہ ساقی نامے کا گزر ممکن تھا اور نہ سراپا کا۔ اس لیے کہ آپ کو ایک عالمِ متبحر کی وفات پر خون کے آنسو بہانا تھے۔ تاہم آپ نے مرثیے کے بعض امہات موضوع یعنی سراپا وغیرہ کو ذوقِ سلیم کی حدمیں، اس جگہ بھی قائم و برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے جیسا کہ ہم آگے چلکر ظاہر کریں گے۔

جس طرح قصیدے کی کامیابی کا دار و مدار بہت کچھ اس کی تشبیب پر ہوتا ہے، ہو بہو اسی طرح مرثیے کا کمالِ تاثیر اُس کے چہرے پر منحصر ہے۔ ایک پختہ کار مرثیہ گو اس حصہ میں براعت الاستہلال کے طور پر ایسے مضامین لکھتا ہے جو اُس کے پورے مرثیے کی عظمت اور تاثیر کو نہ صرف دوبالا کردیتے ہیں بلکہ اس پر حاوی ہوتے ہیں جناب نسیم نے اس مرثیے میں جو کہ ایک عالمِ دین کا مرثیہ ہے، چہرے کے لیے جو بہترین موضوع انتخاب کیا ہے، بلکہ یوں کہیے کہ اس مہم کو سر کرنے کے لیے جو موثر ترین

سلاح استعمال کیا ہے، وہ "علم" ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک عالم کے مرثیے میں کائنات عالم کو اپنا ہمنوا بنانے کے لیے اس سے بہتر کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہو سکتا کہ اول علم کی عظمت موثر پیرایے میں بیان کی جائے۔ ظاہر ہے کہ علم کا موضوع جتنا اہم موضوع تھا اُس سے زیادہ کوئی موضوع اہم نہیں ہو سکتا تھا لیکن جناب تسنیم کی انتہائی کامیابی تھی کہ اُنھوں نے اس پامال شدہ وادی میں وہ عالمانہ شان دکھائی کہ جس کی آج کل کے شاعروں سے کم امید کی جا سکتی ہے۔ آپ نے عظمت علم و فلسفۂ علم پر قرآن و احادیث و مظاہر فطرت سے روشنی ڈال کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ علم کتنی بڑی نعمت ہے اور عالم کے کیا مدارج ہیں۔ تمہید کے یہ بند جس انداز، تسلسل، سلیقے اور خوبی سے نظم ہوئے ہیں، اس کے متعلق میرا خیال تو یہ ہے کہ یہ مضمون اس سے بہتر اسلوب پر استدلالی پہلو کے ساتھ فلسفہ اور مذہب کی روشنی میں نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ملاحظہ ہو چہرے کے پہلے ہی بند کی ابتدا کہاں سے ہوئی ہے اور کس خوبی کے ساتھ علم کی جو سب سے بڑی تعریف کی جا سکتی تھی وہ کی گئی ہے ؎

شمع حریم معرفت کبریا ہے علم ۔۔۔ روحانیت کا دلولۂ ارتقا ہے علم
دنیا و دیں میں از حیات و بقا ہے علم ۔۔۔ ذرہ ہو خلق، عالم بے انتہا ہے علم
یہ کیوں کہوں خدا کا شریک صفات ہے
اللہ سے جدا ہی نہیں عین ذات ہے

مرثیے کے پہلے ہی بند میں علم کو عین ذات بتانے کے بعد وصف علم کی تمام منزلیں ختم ہو چکی تھیں اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب شاعر علم کی کس شان و منزلت سے دنیا کو روشناس کرنا چاہتا ہے لیکن ایمان و قرآن کی روشنی میں آیۂ "الراسخون فی العلم" سے مدد لے کر شاعر آگے بڑھتا ہے اور نہایت اچھوتے انداز سے علم ہی کو سرچشمۂ نبوت و امامت بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر خدا کو امتحان علم لینا نہ ہوتا تو نہ آدم ہوتے اور نہ خدا کی یہ خدائی۔ ملاحظہ ہو:۔

اللہ رے علم منزلت علم۔ شان علم ۔۔۔ تخلیق بو البشر کا سبب امتحان علم
اسلام کیا ہے بہر عمل ترجمان علم ۔۔۔ قرآن بیان علم حدیثیں زبان علم
انسان جو کہ جہل و خودی کا غلام ہے
راسخ ہو علم میں تو نبی یا امام ہے

اس سلسلے میں عظمت علم کے متعلق شاعر نے جو کچھ کہا ہے ہر بند اپنی جگہ بے نظیر ہے لیکن حسب ذیل بند خاص طور پر توجہ طلب ہے جس کے تیسرے اور چوتھے مصرع کے بعد شاعر نے سب کچھ ختم کر دیا تھا اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بیت کے لیے شاعر پانچویں اور چھٹے مصرع کا مضمون کہاں سے لائے گا مگر اس جگہ پانچویں اور چھٹے مصرع کو شاعر نے جس قوت سے کہا ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی فکر میں کتنی بلندی اور قلم میں کتنا زور ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

جہد بقا میں اہل عمل کی سپر ہے علم ۔۔۔ دنیا و دیں میں فاتح باب ظفر ہے علم

بہرِ مجاز چشمِ حقیقت نگر ہے علم　　فطرت کا رازداں نہیں کوئی مگر ہے علم
خاموش ہے اگر تو خدا کی کتاب ہے
جب بولنے لگے تو رسالتمآب ہے

عظمتِ علم کو بیان کرنے کے بعد شاعر نے علم پر ایک فلسفیانہ نظر ڈالی ہے اور فلسفۂ علم کا یہ اندرونی پہلو ظاہر کیا ہے کہ علم کوئی خارجی شے نہیں بلکہ یہ کائنات کی فطرت میں شامل ہے۔ ستاروں نے علم ہیئت و نجوم کا سبق دیا۔ پہاڑ اور بحر و برنے جغرافیہ پڑھایا۔ "ابر و باد و ژالہ و شبنم" نے طبعی علوم سکھائے۔ فطرت کے قاعدوں نے ریاضی کی تعلیم دی۔ خال و خط نے علم مساحت کا مرقع دکھایا وغیرہ وغیرہ۔ یہ بحث معمولی مبحث نہ تھا لیکن شاعر نے جس سلامت روی و اعتدال کے ساتھ سلسلۂ کلام، روانیٔ کلام اور تازگی کلام کو باقی رکھتے ہوئے اس منزل کو طے کیا ہے اُس سے اُس کی پختہ کاری اور وسعتِ نظر پر روشنی پڑتی ہے۔

علم کی فضیلت و فلسفہ بیان کرنے اور عالم کے مرتبہ کو حدیث حضرت رسالتمآبؐ کے مطابق شہید سے زیادہ ثابت کرنے کے بعد شاعر نے یہ بتایا ہے کہ لکھنؤ کو علم و ادب سے کیا خصوصیت ہے اور یہ مبارک سرزمین ایک مدت سے کیسے کیسے نامور شعراء، خطباء، ادباء اور علماء کا مرکز بنتی چلی آرہی ہے۔ اس سلسلے میں شاعر نے لکھنؤ کی عظمت رفتہ کی افسانہ خوانی کے ساتھ ساتھ کس دلپسند عنوان سے تسکینِ دل کا پہلو نکالنے کی کوشش کی ہے کہ "اُجڑی ہوئی بہار سہی پھر بہار ہے"

ملاحظہ ہو پورا بند ؎

اے لکھنؤ شبابِ ریاضِ کہن ہے تو　　اب تک بہارِ علم و ادب کا چمن ہے تو
کچھ کم نہیں یہ فخر کہ فخرِ وطن ہے تو　　ہندوستاں میں کعبۂ اربابِ فن ہے تو
عہدِ قدیم کی عظمت کا مزار ہے
اُجڑی ہوئی بہار سہی پھر بہار ہے

اور آگے بڑھ کر جہاں شاعر نے لکھنؤ کے ادباء، خطباء، علماء اور مرثیہ گو حضرات کا سرسری طور پر ذکر کیا ہے وہاں خلیقؔ و ضمیرؔ و انیسؔ و دبیرؔ کے مزارہائے مقدسہ پر یہ کہکر عقیدت کے پھول چڑھائے ہیں کہ اے لکھنؤ! ؎

تجکو ہے ناز اپنے خلیق و ضمیر پر　　اردو کو ناز تیرے انیس و دبیر پر

مرثیہ چونکہ ایک عالم بزرگ کی وفات سے متأثر ہو کر لکھا گیا تھا لہذا لکھنؤ کے شعراء، ادباء و کاملین کے ذکر کے بعد اس مرثیہ کا ایک مستقل موضوع ہے کہ "لکھنؤ اور اجتہاد"۔ شاعر اس منزل سے جس احتیاط و سلامت روی کے ساتھ گزرا ہے اس پر وہ مستحق مبارکباد ہے، اس لیے کہ عام شاعروں کی طرح اس نے اپنے ہیرو کی منزلت دوسری افراد کاملہ کی حق تلفی کر کے نہیں بڑھانی چاہی ہے بلکہ جو کچھ لکھا ہے وہ علمائے ماسبق کے مدارج کو ملحوظ رکھ کر لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ شاعر کہتا ہے "اے لکھنؤ! ؎

تو علم و اجتہاد کا ہے مہد اولیں　　ہندوستاں میں تیرا مقابل کوئی نہیں

دنیائے بے خبر کو دیا تو نے درسِ دیں　　ہمپایۂ عراق و عجم ہے تری زمیں

بخشا یہ اوج ہادیِ راہِ صواب نے

جنت بنا دیا تجھے غفرانمآب نے

حقیقت کا اس سے زیادہ لطیف پیرایے میں اظہار ناممکن تھا ——— شاعر نے اس کے بعد والے بند میں جناب غفرانمآب علیہ الرحمہ کے بعد کے علمائے باکمال کا سرسری تذکرہ کیا ہے اور اس کے بعد نہایت ہی لطیف اور موثر طریقے سے "علمائے اربعہ" کے کمالات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی جدائی پر خون کے آنسو بہائے ہیں ——— ان علمائے اربعہ سے شاعر کی مراد جناب باقر العلوم اعلی اللہ مقامہ، جناب قدوۃ العلماء اعلی اللہ مقامہ، جناب نجم العلماء اعلی اللہ مقامہ اور ان سب کے بعد ان ارکین اربعہ کے رکن آخر جناب ناصر الملۃ اعلی اللہ مقامہ ہیں ——— شاعر نے علمائے اربعہ کے کمالات کا ذکر کرنے کے بعد ایک عجیب موثر پیرایے میں ان چاروں بزرگوں کا ماتم کیا ہے، اس طرح ؎

حسرت نصیب قوم کے رونے کو تھا نہ کم　　اک باقرِ علوم کی رحلت کا رنج و غم

ناگاہ قدوۃ العلما کا سہا الم　　دیکھا غروب نجم کا منظر بہ چشم نم

ان حادثوں کے بعد یہ محشر گزر گیا

باقی تھا ایک ناصرِ دیں وہ بھی مر گیا

اور آگے بڑھ کر شاعر کہتا ہے ؎

ہر رنج ہے جدا، ہیں جدا ہر الم جدا　　ہر درد کی کسک ہے خدا کی قسم جدا

گو ہو چکے ہیں لاکھ عزیزوں سے ہم جدا　　سب سے مگر ہے ناصرِ ملت کا غم جدا

جو اٹھا اس کے بعد اک اہلِ یقیں رہا

اب ان کے بعد کوئی سہارا نہیں رہا

بس رہ گئی تھی قوم میں تنہا یہی وہ ذات　　کرتی تھی گھر قلوب میں جس کی ہر ایک بات

وہ اب ہے یوں تخمش کرتی ہے کائنات　　اک فرد کی حیات تھی کل قوم کی حیات

ہر داغ اس ملال سے تازہ ہے قوم کا

میت ہے آپ کی کہ جنازہ ہے قوم کا

یہ بند صاف بتاتے ہیں کہ اس آخری حادثۂ جانکاہ سے شاعر کیوں اس قدر بیتاب و متاثر ہو گیا اور وہ کون سی کسک تھی جس نے شاعر کو اس افسانۂ درد کے اظہار پر تیار بلکہ مجبور کر دیا۔

علامہ اقبال نے سچ کہا ہے کہ "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے" یہ حق اور حقیقت ہے۔ چونکہ جناب تسنیم کا حساس دل اس حادثۂ عظمیٰ سے مذکورہ اسباب کی بنا پر بہت زیادہ متاثر تھا لہٰذا اُن کے دل کی نکلی ہوئی آواز اسقدر کامیاب ہوئی ورنہ ہر مرثیہ میں یہ بات کہاں۔ سچ ہے خلوص و صداقت میں بڑی قوت ہوتی ہے۔ جناب تسنیم صاحب مجھے معاف فرمائیں گے اگر میں یہ کہوں کہ اب وہ کسی خارجی اثر سے کوئی ایسا مرثیہ کہنا چاہیں اور کہہ بھی لیں تو ہرگز اس میں وہ بات اور وہ تاثیر

پیدا نہ ہو سکے گی جو اس مرثیہ میں جابجا نظر آ رہی ہے۔ آمد ہے اور بے پناہ آمد۔ آورد کا کہیں نام کو پتہ نہیں۔ محبت اور خلوص کا ایک سیلاب ہے کہ امڈا چلا آ رہا ہے اور شاعر کی طبع رواں جدھر مڑ جاتی ہے اپنے لیے ایک نئی شاہراہ نکال لیتی ہے۔

کہا گیا ہے کہ مرثیہ حقیقۃً ایک بیان حسرت و درد کی نوعیت رکھتا ہے اور جس مرثیہ میں مرثیت یا بَین نہ ہو اُسے ہم حقیقی معنوں میں مرثیہ نہیں کہہ سکتے۔ آئیے ہم اب اس نوعیت سے مرثیہ کا جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ شاعر نے جذبات حسرت و درد کی کس طرح مصوّری کی ہے۔ ملاحظہ ہو مرثیت اور بَین ۔

اے آفتاب علم و حقیقت کہاں ہے تو   اے قوم نامراد کی دولت کہاں ہے تو
ہم پر گرا ہے کوہ مصیبت کہاں ہے تو   نصرت کے وقت ناصرِ ملت کہاں ہے تو

علم و عمل کے قائدِ اعظم کی موت ہے
عالِم کی موت اصل میں عالَم کی موت ہے

اے دل تیرے سکون کا ساماں کہاں ہے آج   اے آنکھ وہ تجلیِ عرفاں کہاں ہے آج
اے ذوقِ علم عالمِ قرآں کہاں ہے آج   اے دینِ پاک ناصرِ ایماں کہاں ہے آج

شمعِ حریم زہد و عبادت کو کیا ہوا
اے شانِ بندگی تری عظمت کو کیا ہوا

اے پیرو رسول حجازی جواب دے   اے قوم کے امام مجازی جواب دے
جلدی براہ بندہ نوازی جواب دے   در پر پکارتے ہیں نمازی جواب دے

کچھ حاجتیں دلوں میں ہیں سائل لیے ہوئے
کچھ لوگ منتظر ہیں مسائل لیے ہوئے

مرثیت اور اس سے زیادہ کامیاب مرثیت ——— بَین اور اس سے زیادہ دلدوز بَین ——— سوائے ایسے مرثیوں کے جو کربلا کے جانگداز و روح فرسا مصائب کے متعلق لکھے گئے ہیں کسی دوسرے مرثیہ میں میری نظر سے نہیں گزرے۔ یہ واقعہ ہے کہ یہ حادثہ ہی ایسا عظیم تھا کہ اس پر شاعر بحیثیت ترجمانِ قوم جو کچھ بھی نہ لکھتا کم تھا اور چونکہ اس کے آنسوؤں میں صداقت کی جھلک تھی اُس کا جو بھی اثر نہ مرتب ہوتا وہ کم تھا۔

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ ایک ایسے مرثیہ میں جیسا کہ اس وقت میرے پیش نظر ہے سراپا کا کوئی موقع ہی نہیں نکل سکتا تھا لیکن شاعر نے اپنے ہیرو اور آفتابِ علم کا سراپا جس عنوان سے کہا ہے یقیناً وہ اُسی کا حصہ ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

ہیں یوں تو دین کے علما سب ہی آفتاب   لیکن جنابِ ناصرِ ملت تھے لاجواب
در پردہ فیضِ شاہِ غیبت سے کامیاب   پیری میں بھی تھا علم و عمل بر سرِ شباب

رگ رگ میں تھا جو عشق حسینؑ غریب کا
جولاں تھا جھریوں میں ٹپکا ہوا حبیب کا

محرابِ بندگی وہ جبینِ نیاز مند   جھکنے سے فرقِ عجز کے سجدہ تھا سربلند
چشمہ علوم کا وہ دہن وقت وعظ و پند   لہجہ وہ خوشگوار کہ قرآں کرے پسند

دل اور دماغ پرتوِ انوارِ اہلبیتؑ
گویا زبان کاشفِ اسرارِ اہلبیتؑ

اسی سراپا کے سلسلے میں آگے بڑھ کر شاعر کہتا ہے ؎

زہد و ورع کا جامۂ پر نور زیبِ تن — علم و عمل. عبا و قبا، فضل پیرہن
پٹکا کمر کا عزمِ تاسّیِ پنجتن — کفشوں میں پیروانِ یداللہ کا چلن

ترجیح تھی جو ذہن کو تیزی میں برق پر
پیچیدہ مسئلوں کا عمامہ تھا فرق پر

ظاہر ہے کہ سراپا کی طرح اس مرثیہ میں رزمیہ شاعری کے جوہر دکھانے کا بھی موقع نہ تھا لیکن شاعر کی طبیعت اس میدان میں بھی رزمیہ نگاری کے جوہر دکھائے بغیر نہیں رکی جس کی شاہد وہ بیتیں ہیں جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں ملاحظہ ہو ؎

(۱) بے تیغ و تیر راہِ خدا میں جہاد تھا — قربان اجتہاد عجب اجتہاد تھا
(۲) عباس نے بھی دے دی سند اجتہاد کی — یوں ابتدا ہوئی جو قلم کے جہاد کی
(۳) چلتی رہی زباں دمِ خنجر کے سامنے — یہ شانِ حق تھی سطوتِ خود سر کے سامنے
(۴) جیسے کھنچی ہوئی اسدِ حق کی ذوالفقار — نوکِ قلم تھی دیدۂ حاسد میں نوکِ خار

اس مرثیہ میں خاص طور سے یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ شاعر نے اپنی شاعری کو مبالغہ اور لفاظی سے بہت حد تک بچایا ہے۔ گو اس کا ممدوح ایک ایسا مجموعۂ صفات تھا کہ اس کی شان میں جو کچھ بھی کہا جاتا وہ کم تھا لیکن شاعر نے اس حفظِ مراتب کے پہلو کا ہر جگہ لحاظ رکھا ہے کہ تعریف اس حد تک نہ پہونچ جائے جو ائمہ کے لیے مخصوص ہے۔ جہاں ائمہ کا ذکر آتا ہے وہاں شاعر نے حفظِ مراتب کا پورا پورا نہ صرف

لحاظ ہی رکھا ہے بلکہ ہیر پھیر کر اپنے مرکزِ اصلی یعنی ذکرِ ائمہ تک اپنے کو پہونچا دیا ہے۔ ملاحظہ ہو شاعر کس فخریہ انداز اور تیور سے کہتا ہے کہ ؎

حیرت ہی کیا جو آپ سلف کے نظیر تھے
آخر تو بابِ علم کے در کے فقیر تھے

مرثیہ میں ایسی مثالیں شاذ نہیں ہیں بلکہ ہر جگہ نظر آتی ہیں، صرف ایک مثال سے ناظرین کے ذہن کو اس پہلو کی طرف متوجہ کر دینا تھا اور بس۔

اس منزل کے بعد اب مرثیہ کا وہ جزو آتا ہے جو گویا مرثیہ کی جان ہے جس میں شاعر نے اپنے ممدوح کی جامعیتِ علمی، نسب، رجحانِ طبع اور تصانیف پر سیر حاصل بحث کرنے کے ساتھ ساتھ سیرت نگاری کا فرض ادا کیا ہے۔ یہ منزل حقیقۃً دشوار گزار منزل تھی اور بہت سخت اس لیے کہ میرے نزدیک جناب سرکار ناصر الملۃ اعلی اللہ مقامہ کی جامعیتِ علمی، سیرت اور تصانیف پر تبصرہ کا فرض وہی شخص ادا کر سکتا تھا جو سرکار اعلی اللہ مقامہ کی سی بلند پایہ حیثیت کا عالم ہوتا۔ آپ کی سیرت پر وہی روشنی ڈال سکتا تھا جس نے آپ کی سیرت کا غور سے مطالعہ کیا ہوتا اور خود بھی ایک ایسی سیرت کا مالک ہوتا کہ سیرت کے صاف و شفاف آئینہ سے اپنے قلب میں ضیائے صحیح پیدا کر سکتا۔ یہ ظاہر ہے جنابِ نسیم کتنے ہی کامیاب شاعر سہی، خاندانِ علما و فضلا سے سہی، فاضل ادیب و فاضل فقیہ سہی، لیکن بہرحال عالم نہیں کہے جا سکتے۔ ان کا سرکار ناصر الملۃ اعلی اللہ مقامہ کی زندگی میں دربارِ ناصری سے کوئی خاص تعلق اور

نگاؤ نہ تھا۔ خود جنابِ نسیم کے ارشاد کے مطابق وہ سرکار اعلی اللہ مقامہ کی زندگی میں علاوہ محافل و مجالس کے صرف، دو بار جناب مرحوم کی خدمت میں شرف باریابی حاصل کر سکے تھے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ سرکار اعلی اللہ مقامہ کی سیرت نگاری بھی ان کے لیے بے حد دشوار کام تھا۔ ایک طرف ہیرو کی زبردست شخصیت دوسری طرف جنابِ نسیم کی مرحوم کی مجلس علمی سے دوری، ان اسباب کے ہوتے ہوئے سیرت نگاری کوئی آسان کام نہ تھا۔ لیکن اس میدان میں بھی جنابِ نسیم نہ صرف بہت حد تک کامیاب نظر آتے ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اُن کے دل کی آنکھوں نے وہ سب کچھ دیکھا ہے جس سے ظاہری آنکھیں محروم ہیں۔ ملاحظہ ہو

تھے باوجودِ سلطنتِ علم خاکسار — شکوہ نہ دوستوں سے نہ اعدا سے تھا غبار
بہرِ گدا مجسمۂ خُلق و انکسار — اربابِ زر کی بزم میں خود دارِ باوقار

عالَم کی رفعتیں تھیں جبینِ نیاز میں
روح القدس کا فیض لباسِ مجاز میں

صورت میں وہ محاسنِ ساداتِ فاطمی — سیرت میں وہ مکارمِ اخلاقِ احمدی
ایثار و حلم و زہد و تواضع سے تھا جلی — ہندوستاں کے آپ ہیں سلمانِ فارسی

علم و عمل جو ساتھ ریاضت سمیت تھے
اک نقش پائے قافلۂ اہلبیت تھے

سیرت کے متعلق ایسے اور بہت سے بند پیش کیے جا سکتے ہیں لیکن مجھے خوف ہے کہ اگر

میں انھیں پیش کروں اور جنابِ نسیم نے جن باتوں کو اشاروں میں کہا ہے اُن کی ذرا اور وضاحت کرنے لگوں تو یہ مضمون جو خود ہی طولانی ہو گیا ہے کہیں ایک مستقل کتاب کی نوعیت نہ اختیار کر لے۔ لہٰذا میں صرف اس موضوع پر اتنا ہی کہہ دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ شاعر کی اس سیرت نگاری کو دیکھ کر اُس کی کراماتِ شاعری کا قائل ہونا پڑتا ہے اور اُس کے ذہنِ رسا کی بلندی کا معترف۔ دل مسوس کر رہ گیا کہ سرکار اعلی اللہ مقامہ کی سیرت کے متعلق جنابِ نسیم نے جو اشارے کیے ہیں ان کی میں کچھ اور وضاحت کر سکتا۔ کیونکہ میرے عقیدے کے مطابق وہ گو ایک غیر معصوم تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ ایک ایسا آئینہ بھی تھے جس میں [illegible] نظر آتا تھا۔ جیسا کہ میں ایک موقع پر نظم میں کہہ چکا ہوں کہ

"ایسا آئینہ کہ ظاہر جس میں ہو عکسِ امام"

یا دوسرے موقع پر اسی خیال کا اس طرح اعادہ کیا ہے کہ:۔

اِک خدا پر ناز سب سے بے نیازی تجھ میں تھی — کچھ اماموں کی سی شانِ امتیازی تجھ میں تھی

ظاہر ہے کہ جنابِ نسیم کے ہیرو اور اپنے آقائے اعلی اللہ مقامہ کے متعلق جب میرا عقیدہ یہ ہو اور میں ان کی بلندی سیرت کا اس حد تک معترف ہوں تو میں اس سلسلہ میں جو کچھ بھی نہ کہوں وہ کم ہے۔ کاش اس کا خدا کبھی کوئی موقع دے کہ میں اس عظیم المرتبت ہستی کی سیرت پر کوئی سیر حاصل بحث کر سکوں۔ آہ آہ!

مرثیہ میں اور تصانیف کا ذکر ——— ظاہر ہے کہ یہ چیز مذاقِ عام سے

بہت بلند تھی اور بحث بھی نہایت خشک لیکن اس بحث خشک میں بھی جناب نسیم نے جو رنگ آفرینی کی ہے وہ انہی کا کام تھا اور اس دشوار منزل کو جس قدر آسان بنایا ہے وہ انہی کا حصہ۔ تصانیف کے نام بھی نظم کیے ہیں اور اُن کا موضوع بحث بھی۔ معلوم ہوتا ہے جیسے آپ نے تمام تصنیفات کا عمیق نگاہوں سے مطالعہ کرکے اُن کا عطر کھینچ لیا ہے ـــــ اور لطف یہ ہے کہ جابجا شاعرانہ لطافتوں سے اس وادی خشک کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

مرثیہ کی اس منزل کے بعد شاعر کا قلم واقعہ نگاری اور مرقع نگاری کی طرف مُڑ گیا ہے جس میں تابوت مبارک کی آگرہ کو روانگی، کربلائے امین الدولہ کی مجلس اور جنازے کی اسٹیشن سے روانگی کے مناظر پیش کیے ہیں اور یہ دکھایا ہے کہ جنازے کی شان کیا تھی اور اہلِ عقیدت کس طرح ماتم کر رہے تھے وغیرہ وغیرہ۔ افسوس ہے کہ تبصرہ نگار کا قلب ضعیف اس کا تحمل نہیں رکھتا کہ مرثیہ کے اس حصہ پر کوئی تبصرہ کرسکے۔ آہ آہ کیسے جاں سوز مناظر تھے ـــــ اور کیسا اندوہناک موقع ـــــ ناظرین، مرثیہ کے اس حصہ کو خود پڑھیں اور آنسو بہائیں کاش کہ وہ منظر ان آنکھوں نے نہ دیکھا ہوتا جس کے متعلق تشبیہ سے کام لے کر شاعر کہتا ہے

جانِ عمل کی لاش تھی ملت کے دوش پر
پروانوں کا ہجوم تھا شمعِ خموش پر

لکھنؤ اسٹیشن سے لاش مبارک کی روانگی کے بعد اہلِ کانپور کی طرف سے جنازے

کے خیر مقدم، لکھنؤ سے آگرہ لاش کے پہونچنے، اور وہاں سے مزارِ جناب قاضی نور اللہ شوستری تک لائے جانے کے مناظر دکھائے گئے ہیں جس میں آگرہ کی تمام اقوام نے شرکت کی تھی اور تمام امیر و غریب ایک دوسرے کے دوش بدوش مساوات اسلامی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیشوائے قوم کی نعش لے جا رہے تھے۔ اس منظر کی تصویر کشی مختصر لفظوں میں شاعر نے یوں کی ہے ؎

پہلو میں تھے عوام کے اشخاص مقتدر

منظر تھا حجِ بیتِ خدائے قدیر کا
احساس مٹ گیا تھا غریب و امیر کا

اس کے بعد شاعر قاضی صاحب کے مزار پر پہونچتا ہے اور ایسے جلیل القدر مہمان کے، عظیم الشان میزبان کی مدح میں تر زبان نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو جناب قاضی صاحب علیہ الرحمہ کی شان میں یہ بند ؎

نورانیت کے حسن سے نکھری ہوئی حیات
نور الٰہ نور جہاں نور کائنات
تابانیوں سے جس کی منور جلی کی رات
ہر قطرہ جس کے خوں کا صداقت کی اک فرات
جو وجد میں تھا جامِ شہادت پیے ہوئے
سر پر حسینیت کا پھریرا لیے ہوئے

اُس کے بعد آگرے کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

اے آگرے کی خاک حریمِ وفا ہے تو
راہِ طلب میں جادۂ وحدت نما ہے تو
قبرِ شہید و مشہدِ صبر و رضا ہے تو
ہندوستاں کی گود میں اک کربلا ہے تو

چشمہ اُبل رہا ہے جو عزمِ حیات کا

جمنا میں کوئی سوت ہے شاید فرات کا

اسی سلسلے میں شاعر نے سرکار ناصر الملۃ اعلی اللہ مقامہ کی تاریخ وفات و تاریخ دفن بھی مرثیہ میں نظم کر دی ہے اور اس خوبی سے کہ اگر ان مصرعوں کے نیچے وفات و دفن کے سن نہ لکھے ہوتے تو شاید یہ سمجھنا بھی دشوار ہوتا کہ اس بے تکلفی اور روانی کے ساتھ کیا مصرع تاریخ بھی کہا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ ہوں کیسے صاف مصرعے ہیں

ہیں علم و دین ناصرِ ملت کے سوگوار	۱۳۶۱ھ تاریخ وفات
وہ نور کے مزار میں ناصر کی لاش ہے	۱۳۶۲ھ تاریخ دفن

حالات دفن کو نظم کرنے کے بعد شاعر نے اس عنوان پر مرثیہ کو ختم کیا ہے "لکھنؤ کا پیام آگرہ کے نام" یہ پیام کئی بند پر مشتمل ہے۔ مرثیہ کے اس حصہ کو اس انداز سے کہا گیا ہے کہ کوئی آنکھ خون کے آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتی اور اس خیال کو پیش نظر رکھ کر کہ یہی آنسو وسیلہ نجات بھی بن جائیں مرثیے کے آخری بندوں میں ایک عجیب و غریب عنوان سے واقعات کربلا کی یاد کو تازہ کر دیا گیا ہے۔ یہ ہے کمال شاعری کہ مرثیہ گو ہر منزل کو طے کرنے کے بعد آخر میں اپنی ہی منزل یعنی ذکر شہادت حسین پر آ گیا ہے اور آگرہ کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ:

تو ناشناس رتبۂ اہلِ وفا نہیں — کوفہ نہیں دمشق نہیں کربلا نہیں

ہرگز یہاں کسی کا بھرا گھر لٹا نہیں — بے شیر کا لہو کبھی تجھ پر بہا نہیں

جمنا پہ کوئی ذبح کہاں تشنہ لب ہوا

لاشہ ترے شہید کا پامال کب ہوا

لوٹی گئی نہ تجھ پہ کسی کی حرم سرا — تو نے کسی مریض کو قیدی نہیں کیا

بے وارثوں کے سر سے نہ تجھ پر چھنی ردا — مہماں بلا کے تو نے کسی سے نہ کی دغا

اس وقت یاد آ گئی ناچاری حسینؑ

فریاد از غریبی و بے یاری حسینؑ

جنابِ نسیم کے مرثیہ پر سلسلہ کے ساتھ اظہار خیال کرنے سے میرا منشا یہ تھا کہ اس کی اُس خوبی پر واضح نظر پڑ جائے جو مرثیہ کی جان ہے یعنی یہ کہ مرثیہ کا خاکہ کتنے سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے اور تمام اُن ضروری باتوں کو جو اس مرثیہ کے لیے ضروری تھیں کس طرح جمع کر دیا ہے —— اب رہا مرثیہ کا زور، بندش کی چستی، فصاحت، کلام کی پختگی، لفظوں کا برمحل استعمال، روزمرہ اور آمد — یہ ایسی چیزیں ہیں کہ جن کے متعلق مجھے کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ پورا مرثیہ خود اس کا شاہد ہے کہ وہ لطافت و حسن و بیان و معانی سے کس طرح آراستہ و پیراستہ ہے۔

جنابِ نسیم یقیناً مستحق مبارکباد ہیں کہ انہوں نے مرثیہ کے لیے ایک نئی منزل اختیار کی اور اس منزل کو شروع سے آخر تک کامیابی سے طے کیا۔ ان کی یہ کوشش یقیناً قوم میں ممدوح و مقبول ہو کر رہے گی اور مجھے قوی

امید ہے کہ اس مرثیہ کے ذریعہ سے انھوں نے مرثیہ گوئی کی جو داغ بیل ڈالی
ہے وہ دوسروں کے لیے قابل تاسی ہوگی حقیقتًہ یہ مرثیہ صرف ایک مرثیہ ہی
نہیں ہے بلکہ اس سے اس کا اظہار ہوتا ہے کہ قوم کو اپنے محسنوں کی یاد کس
طرح تازہ رکھنا چاہیے اور ایک نیک و پاک ہستی کے خیال کو ذہن میں رکھ کر جو
صرف عالم ہی نہیں بلکہ مجسمۂ عمل بھی تھا۔ ہم اپنے دلوں میں کیونکر روح عمل پیدا
کر سکتے ہیں۔ شاعر کا کام قوم و ملت میں اس طرح کی روح عمل کا پیدا کرنا ہے
اور ہم جنابِ نسیم کو مبارکباد دیں گے کہ وہ اس عظیم الشان مقصد میں کامیاب ہو گئے

اسد

۲۲۔ اکتوبر سنہ ۱۹۴۳ء

مرثیۂ ناصر الملت

رباعی وسلام

یہ رباعی جناب تسنیم صاحب نے دفن ناصر الملۃ اعلی اللہ مقامہ
کی مجلس میں قاضی صاحب کے مزار پر مرثیہ سے پہلے ارشاد فرمائی

اسلام سے چاہ کر کے پیتا ہوں میں
توبہ ! جو گناہ کر کے پیتا ہوں میں
ناصر کی مئے ولا، بفیضِ منصور[1]
قاضی کو گواہ کر کے پیتا ہوں میں

سلام

بس یہی تھا آخری اک علم و حکمت کا چراغ
اٹھ گیا ناصر۔ بجھا تعمیرِ ملت کا چراغ
اک خزانہ تھا عرب کی رفعتوں کا ھند میں
بتکدے میں ایک تھا کعبے کی عظمت کا چراغ
گلفشاں مثلِ زبانِ شمع تھی شمعِ زباں
جس کے دم سے دے رہا تھا لو خطابت کا چراغ

---

[1] امام زمانہ ۱۲

بزم تھی اس رہنما کی یا قیادت کا فروغ
علم کا جلوہ اور اس سہ ٹربہ کے سیرت کا چراغ

عالمِ علمِ شریعت نائب مہدیؑ دیں
عالمِ غیبت میں دنیائے نیابت کا چراغ

جھلملاتی تھی جو شمعِ فکر وقتِ اجتہاد
لو بڑھا دیتا تھا خود جیکے سے غیبت کا چراغ

اُس مصنف کی بیاں کیا ہوں تجلّی پر بیاں
تھی سیاہی بھی قلم کی جس کے ظلمت کا چراغ

مرجعِ تنظیمِ ملت۔ مرکزِ فقہ و حدیث
قوم کی عزّت کا پروانہ شریعت کا چراغ

فیضِ باطن سے گرہ دی تھی ہوا میں نور کی
بن گیا تھا ہر نفس گویا ہدایت کا چراغ

قبرِ ناصر نور کی منزل رہے گی تا ابد
ضوفشاں ہے سامنے بزمِ شہادت کا چراغ[1]

علم کا اجڑا چمن کیا گل کھلائے اب نسیم
دل بجھا۔ گل ہو گیا نظمِ طبیعت کا چراغ

---

[1] قاضی نور اللہ شوستری ۱۲

علم کی عظمت ــــــ

شمعِ حریمِ معرفتِ کبریا ہے علم ۔۔۔ روحانیت کا ولولۂ ارتقا ہے علم
دنیا و دیں میں رازِ حیات و بقا ہے علم ۔۔۔ ذرہ ہے خلق۔ عالمِ بے انتہا ہے علم

یہ کیوں کہوں خدا کا شریکِ صفات ہے
اللہ سے جدا ہی نہیں عینِ ذات ہے

اللہ رے علم۔ منزلتِ علم۔ شانِ علم ۔۔۔ تخلیقِ ابو البشرؑ کا سبب۔ امتحانِ علم
اسلام کیا ہے؟ بہرِ عملِ ترجمانِ علم ۔۔۔ قرآں بیانِ علم۔ حدیثیں زبانِ علم

انسان جو کہ جہل و خودی کا غلام ہے
راسخ[1] ہو علم میں تو نبی یا امام ہے

نافع حواس و عقل و ہیں ہیں جہاں ہے علم ۔۔۔ روحِ بصر ہے علم بصیرت کی جاں ہے علم
پردہ کشائے عظمتِ کون و مکاں ہے علم ۔۔۔ معراجِ بندگی کے لیے نردبان[2] ہے علم

بے علم۔ بے خبر ہے حقیقت کی راہ میں
اندھے کو کیا ملے گا بھلا جلوہ گاہ میں

---

[1] آیۂ "لا یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم" کی طرف اشارہ ہے ۱۲ [2] سلّم سیڑھی ۱۲

یہ علم دو جہاں میں وہ نعمت ہے لاجواب
اپنے لیے خدا نے کیا جس کو انتخاب

آدمؑ ہوئے جو اس کی فضیلت سے فیضیاب
بخشا خدا نے اشرفِ مخلوق کا خطاب

جس نے رکھا عزیز وہ انسان ہو گیا
تحقیر جس[1] نے کی وہی شیطان ہو گیا

جہدِ بقا میں اہلِ عمل کی سپر ہے علم
دنیا و دیں میں فاتحِ بابِ ظفر ہے علم

بحرِ مجاز، چشمِ حقیقت نگر ہے علم
فطرت کا راز داں نہیں کوئی مگر ہے علم

خاموش ہے اگر تو خدا کی کتاب ہے
جب بولنے لگے تو رسالتمآب ہے

علم پر ایک فلسفیانہ نظر ——

ہے سرمدی علوم کا چشمہ یہ کائنات
ہر ذرۂ جماد۔ ہر اک ریشۂ نبات

اک درسگاہ ہے۔ جسے کہتے ہیں ہم حیات
تعلیم دے رہے ہیں مسلسل تغیرات

ہر برگ یاں ہے دفترِ عرفاں لیے ہوئے
ہر خار معرفت کا گلستاں لیے ہوئے

یہ ختمِ شب یہ گرمیِ ہنگامۂ سحر
یہ صبح اور یہ دن کی تجلی یہ دوپہر

یہ شام اور یہ شام کے لمحاتِ مختصر
یہ رات اور رات میں یہ انجم و قمر

---

[1] آیۂ "علم آدم الاسماء کلہا اور فسجدوا الا ابلیس" سے ماخوذ ہے ۱۲

اک درس دے رہے ہیں جہاں کو علوم کا
ہیئت کا مدرسہ ہیں، تو مکتب نجوم کا

یہ موسمِ بہار یہ رعنائیِ چمن
پھولوں کا یہ نکھار شگوفے یہ گلبدن

پودوں کا یہ شباب۔ یہ شاخوں کا بانکپن
سرو و صنوبر و گل و ریحان و یاسمن

سب مدرسے ہیں انجمنِ کائنات کے
دن رات گل کھلاتے ہیں علمِ نبات کے

یہ عالمِ جبال یہ دنیائے بحر و بر
جغرافیے کے موجد و بانی ہیں سر بسر

یہ ابر و باد و ژالہ و شبنم یہ خشک و تر
طبعی علوم کا ہیں خزانہ پئے بشر

پنہاں جو خط[1] و خال ہیں نقشِ شہود میں
آیا اسی سے علمِ مساحت وجود میں

ہوتے ہیں روز و شب جو زمانے میں واقعات
مل جل کے لکھ رہے ہیں یہ تاریخ کائنات

علمِ حیات کی ہے بنا خود یہی حیات
ہر چیز ہر وجود ہر اک شے ہر ایک بات

ہر فلسفے کی عقلِ بشر راز دار ہے
منطق ہمارے نطق کا اک شاہکار ہے

برقِ تپاں سے حکمتِ برقی ہے ضو فشاں
فطرت کے قاعدے ہیں ریاضی کے راز داں

طب کا وجود جسمِ بشر میں ہے خود نہاں
فنِ سرود نغمۂ بلبل سے ہے عیاں

---

[1] نقطہ اور خط ہی علم مساحت کا موضوع ہیں ۱۲

تمہیدِ ساز۔ بربطِ بادِ بہار ہے
استادِ رقص۔ گردشِ لیل و نہار ہے

ڈالے جو خلقتِ بشری پر کوئی نگاہ
پائے گا اس کو عالمِ اکبر[1] کی جلوہ گاہ

مخفی مجاز میں ہے حقیقت۔ خدا گواہ
حق تو یہ ہے کہ وہمِ "انا الحق" نہیں گناہ

خود نفس کا بغورِ بشر امتحان لے
پہچان لے خدا کو جو اپنے کو جان لے[2]

حاصل بدونِ علم نہیں دین کا کمال
سجدہ ملائکہ کا بشر کو، ہے اِس پہ دال

کیا کیا بیاں ہو علم کے فضل و شرف کا حال
دنیا اگر ہے مال تو ہے علم راسِ مال

حد ہو گئی کہ فضلِ خدائے مجید سے
عالم کا مرتبہ ہے زیادہ شہید[3] سے

آفاق میں فریضۂ سمع و بصر ہے علم
ایماں ہے استوارِ بشر کا۔ اگر ہے علم

اُس سمت حق کی جلوہ گری ہو، جدھر ہے علم
خالق ہے جس کی حدِّ نظر۔ وہ نظر ہے علم

بے علم شانِ حق کو کبھی جانتا نہیں
جو جانتا نہیں ہے وہ پہچانتا نہیں

وہ آنکھ جو ہے ذوقِ بصیرت سے بے نیاز
وہ کان جو کہ سُن نہ سکے نغمہ ہائے راز

وہ عقل جس کو فکر و نظر سے ہو احتراز
وہ دل کہ جس میں سوزِ طلب سے نہیں گداز

---

[1] کلام حضرت علیؑ "و فیک انطوی العالم الاکبر" سے ماخوذ ہے ۱۲ [2] ماخوذ از حدیث رسالتمآب ۱۲

جس کا یہ رنگ ڈھنگ یہ شیوہ یہ طور ہے
واللہ آدمی وہ نہیں ہے کچھ اور ہے

دریا ہے خود معلّمِ علم شناوری
ہر اک صدف ہے بحر کے دامن میں جوہری

غافل! اگر نہ جادۂ ہستی سے سرسری
ہر نقشِ پا سے ہوتی ہے بینائی کی رہبری

علم و ہنر کی عرصۂ ہستی میں دھوم ہے
ہر ذرہ اک کتابِ فنون و علوم ہے

لکھنؤ کا تعلق علم و ادب سے ــــــــ

بزمِ شہود میں یہ اشاراتِ رنگ و بو
حکمت کا درس دیتی ہے فطرت ہر ایک سو

ہر ملک و قوم کی ہے یہی قوتِ نمو
چیدہ ہزار میں ہے اِسی سے تو لکھنؤ

یہ خاکِ علم شامِ اودھ کا وہ چاند ہے
جلووں سے جس کے صبحِ بنارس[1] بھی ماند ہے

اے لکھنؤ شبابِ ریاضِ کہن ہے تو
اب تک بہارِ علم و ادب کا چمن ہی تو

کچھ کم نہیں یہ فخر کہ فخرِ وطن ہے تو
ہندوستاں میں کعبۂ اربابِ فن ہی تو

عہدِ قدیم کی عظمت کا مزار ہے
اُجڑی ہوئی بہار سہی۔ پھر بہار ہے

تیرا ہے ذرہ ذرہ قدامت کا آئنہ
ہر شاعر و خطیب، فصاحت کا آئنہ

---

[1] یہ بھی علوم قدیمۂ ہند کا مرکز ہے ۱۲

ہر عالمِ فقیہ، ہدایت کا آئنہ — ہر نائبِ امام، امامت کا آئنہ
تو دین کے علوم کی دولت لیے ہوئے
ہے گود میں بہارِ رسالت لیے ہوئے

دنیائے معرفت میں جو ہیں صاحبِ نگاہ — اُن کی نظر میں تو ہی حقیقت کی درگاہ
جادے بنا دیے ہیں وہ تو نے میانِ راہ — انکار جن سے علم کے مذہب میں ہے گناہ
تجکو ہے فخر اپنے خلیقؔ و ضمیرؔ پر
اردو کو ناز تیرے انیسؔ و دبیرؔ پر

فاضل ہیں تیرے فضل کی دنیا میں لاجواب — عالم ہیں تیرے علم کی مجلس میں انتخاب
ناثر ہیں تیرے نثر کی منزل میں کامیاب — شاعر ہیں تیرے شعر کے مطلع کا آفتاب
ہے تیز تر شرابِ سخن تیرے جام میں
دریائے گومتی کی روانی کلام میں

وہ تیری بات چیت، سلاست لیے ہوئے — جملے فصیح۔ خاص لطافت لیے ہوئے
لہجہ وہ دلنشین حلاوت لیے ہوئے — لفظوں کی شوخیاں بھی متانت لیے ہوئے
کیا خوب روزمرہ ہے! کیا بول چال ہے
تو اس صفت میں آپ ہی اپنی مثال ہے

لکھنؤ اور اجتہاد ———

تو علم و اجتہاد کا ہے مہدِ اوّلیں — ہندوستاں میں تیرا مقابل کوئی نہیں

دنیائے بیخبر کو دیا تو نے درسِ دیں — ہمپایۂ عراق و عجم تیری سرزمیں
بخشا یہ اوج ہادیٔ راہِ صواب نے
جنت بنا دیا تجھے غفراں مآب[1] نے

پائے ہر ایک عہد میں تو نے وہ باکمال — جن کے فیوضِ علم کی دولت ہے لازوال
وہ عالمانِ امتِ محبوبِ ذوالجلال — جو انبیائے عترتِ یعقوب کی مثال
تھی یوں تو ابتدا میں بھی اک انتہا کی شان
آخر کے دور میں ہے تسلسل۔ خدا کی شان

علمائے اربعہ ———

بےمثل تھے زمانۂ آخر کے پیشوا — آقائے قوم۔ باقرِ دیں۔ نجمِ اہتدا
وہ ناصرِ شریعتِ غرّائے مصطفےٰ — تھے چار رکنِ سلطنتِ زہد و اتقا
چاروں امیرِ قوم۔ غلامانِ پنجتن
پانچ انگلیوں سے طالبِ دامانِ پنجتن

ہیں عالمِ جلیل۔ یہ صورت سے تھا عیاں — یکتا عمل میں علم میں لاثانیِ جہاں
حق بین و حق پسند و حق آئین و حق نشاں — اس دور کے چہار عناصر بجسم و جاں
عارف تھے دینِ پاکِ رسولِ حجاز کے
سجدے تھے چارِ صبحِ عمل کی نماز کے

---

[1] جناب مولوی سید دلدار علی صاحب قبلہ مرحوم اعلی اللہ مقامہ خاندان اجتہاد کے مورثِ اعلیٰ ۱۲۰۵ھ میں صدر نشینِ سرا ساتاکیے

چاروں، اصولِ خمسہ[1] ایماں کی تھے پناہ — تھے بس فروعِ ستہ[2] دیں مرکزِ نگا
ساتوں طبق زمیں کے ہیں اس بات پر گواہ — آٹھوں پہر تھی صرفِ ہدایت کی دل
تھے جانشیں یہ بادشہِ انس و جاں کے چار
جیسے کہ ہیں سفیر امامِ زماں کے چار[3]

پردے میں ہے جو حجتِ موعودؑ کا مقام — یہ غیبتِ امام میں تھے نائبِ اما
مہدیِ دیں کے بندہ در - ہادیِ انام[4] — تفسیرِ اہلبیت سے واقف بلا کلا
غیبت سے اہلِ علم ہمارے چمک اٹھے
سورج چھپا تو چاند ستارے چمک اٹھے

علمائے اربعہ کا مرثیہ ———

اے چرخ اب وہ مطلعِ انوار کیا ہوئے — اے لکھنؤ وہ عالمِ دیندار کیا ہوئے
دنیا و دیں کے محرمِ اسرار کیا ہوئے — علم و عمل کے قافلہ سالار کیا ہوئے
ویراں دکھائی دیتی ہے دنیائے لکھنؤ
آتی ہے شامِ غم سے صدا ہائے لکھنؤ

حسرت نصیب قوم کے رونے کو تھا نہ کم — اک باقرِ علوم کی رحلت کا رنج و غم
ناگاہ قدوۃ العلما[5] کا سہا الم — دیکھا غروبِ نجم کا منظر بچشمِ نم

---

[1] پانچوں اصول دین ۱۲ [2] چھ فروع دین ۱۲ [3] عثمان بن سعید۔ محمد بن عثمان۔ حسین بن ر
علی بن محمد ۱۲ [5] جناب مولوی سید آقا حسن صاحب قبلہ مرحوم اعلی اللہ مقامہ ۱۲

اِن حادثوں کے بعد یہ محشر گزر گیا
باقی تھا ایک ناصرِ دیں وہ بھی مر گیا

ناصر الملۃ کا مرثیہ ———

بس رہ گئی تھی قوم میں تنہا یہی وہ ذات — کرتی تھی گھر قلوب میں جس کی ہر ایک بات
وہ اب ہے یوں خموش کہ روتی ہے کائنات — اک فرد کی حیات تھی کُل قوم کی حیات
ہر داغ اس ملال سے تازہ ہے قوم کا
میت ہے آپ کی کہ جنازہ ہے قوم کا

ہر رنج ہے جہاں میں جُدا ہر الم جُدا — ہر درد کی کسک ہے خدا کی قسم جُدا
گو ہو چکے ہیں لاکھ عزیزوں سے ہم جُدا — سب سے مگر ہے ناصرِ ملت کا غم جُدا
جو اُٹھا اُس کے بعد اک اہلِ یقیں رہا
اب اِن کے بعد کوئی سہارا نہیں رہا

ملت ہے آج ناصرِ ملت کی سوگوار — گم گشتہ قوم خضرِ ہدایت کی سوگوار
انسانیت محاسنِ فطرت کی سوگوار — روحانیت علومِ حقیقت کی سوگوار
چپ ہے حدیث حامی و ناصر کی یاد میں
قرآں ہے خموش مُفسّر کی یاد میں

فقہ و حدیث کا جو ہے لاشہ کفن بدوش — غم سے ہے چاک چاک گریبانِ عقل و ہوش
فرطِ الم سے مجلسِ ارشاد ہے خموش — محراب سرنگوں ہے تو منبر سیاہ پوش

ملت کا مرثیہ بھی ہے اس شور و شین میں
ماتم بپا ہے بزمِ عزائے حسینؑ میں

سینہ وفورِ غم سے ہے علم و عمل کا چاک
سرخم کیے ہے رحل کے اوپر کتابِ پاک

قاری کا لہجہ وقتِ تلاوت ہے دردناک
تسبیح ہے نڈھال تو سجّادہ سر بخاک

ماتم جو خضرِ راہِ شریعت کا عام ہے
طاعت بھی غم میں پلٹ[1] کے زانو تمام ہے

اے آفتابِ علم و حقیقت کہاں ہے تو
اے قوم نامراد کی دولت کہاں ہے

ہم پہ گرا ہے کوہِ مصیبت کہاں ہے تو
نصرت کے وقت ناصرِ ملت کہاں ہے

علم و عمل کے قائدِ اعظم کی موت ہے
عالِم کی موت[2] اصل میں عالَم کی موت ہے

اے دل ترے سکون کا ساماں کہاں ہے آج
اے آنکھ وہ تجلیِ عرفاں کہاں ہے آج

اے ذوقِ علم۔ عالمِ قرآں کہاں ہے آج
اے دینِ پاک۔ ناصرِ ایماں کہاں ہے آج

شمعِ حریمِ زہد و عبادت کو کیا ہوا!
اے شانِ بندگی۔ تری عظمت کو کیا ہوا

اے پیروِ رسولِ حجازی جواب دے
اے قوم کے امامِ مجازی جواب دے

جلدی براہِ بندہ نوازی جواب دے
در پہ پکارتے ہیں۔ نمازی جواب دے

---

[1] سلام کے بعد کی تکبیراتِ ثلاثہ کے لیے نہایت لطیف حسنِ تعلیل ہے [2] حدیث "موت العالِم موت العالَم" کا ترجمہ

کچھ حاجتیں دلوں میں ہیں سائل لیے ہوئے
کچھ لوگ منتظر ہیں مسائل لیے ہوئے

اے لکھنؤ امیرِ شریعت کدھر گیا
اے گومتی فیوض کا دریا اتر گیا

اے بزمِ علم و لولۂ علم مر گیا
اے قوم تیرا حامی و ناصر گزر گیا

دنیا سے اٹھ گیا جو نگہباں تھا دین کا
پرسہ امامِ وقت کو دو جانشین کا

ناصر الملۃ کا علمی اور روحانی مرقع

تھی آپ کی حیات سے ملت کی زندگی
فضل و کمال و علم و حقیقت کی زندگی

زہد و ریاض و رشد و عبادت کی زندگی
مہدیؑ کے فیض سے تھی ہدایت کی زندگی

دل میں جو یہ تھے رازِ نیابت لیے ہوئے
تھی گود میں شہود کو غیبت لیے ہوئے

جڑ ہے امام اور علما برگ و بار ہیں
وہ بوئے گل ہے اور یہ رنگِ بہار ہیں

عالم میں وہ نہاں ہے تو یہ آشکار ہیں
وہ راز کردگار ہے یہ رازدار ہیں

ہاں اے نگاہِ شوق بھٹکنا نہ راہ میں
ذرّے بھی آفتاب ہیں اس جلوہ گاہ میں

ہیں یوں تو دین کے علما سب ہی آفتاب
لیکن جنابِ ناصرِ ملت تھے لاجواب

در پردہ فیضِ شاہِ عنایت سے کامیاب
پیری میں بھی تھا علم و عمل پر سرِ شباب

رگ رگ میں تھا جو عشق حسینِ غریب کا
جولاں تھا جھرّیوں میں بڑھاپا حبیبؑ کا

محرابِ بندگی تھی جبینِ نیازمند | جھکنے سے فرقِ عجز کے سجدہ تھا سر...
چشمہ علوم کا تھا دہن وقتِ وعظ و پند | لہجہ وہ خوشگوار کہ قرآں کرے ...

دل اور دماغ پرتوِ انوارِ اہلبیتؑ
گویا زبان، کاشفِ اسرارِ اہلبیتؑ

اندازِ بوعلی وہ تکلم سے آشکار | روحِ مفیدِ حسنِ افادات سے ...
وہ شانِ مرتضیٰ کہ رضیؔ کو بھی افتخار | صدرا سے بیش بیش محقق سے ...

حیرت ہے کیا جو آپ سلف کی نظیر تھے
آخر تو بابِ علم کے در کے فقیر تھے

حلّی کی شان سیدِ نوری کا نورِ ذات | مجلس نشینِ علم و ادب مجلسی ص...
پیشِ نگاہ باقرِ داماد کی حیات | نوشاہ تھے حضور تو علم و عمل ...

سہرا لگا کے فقہ و حدیث و رجال کا
مجرا کیا قبولِ عروسِ کمال کا

جامعیت علمی

طوسی سے جامعیتِ علمی میں بیشتر | تفسیر پہ عبور تواریخ پر ...
فقہ و اصول و منطق و حکمت سے بہرہ ور | واقفِ رجال سے، تو حدیثوں ...

شیرینیاں کلام و ادب کی زبان میں
مثلِ عرب، بلیغ معانی بیان میں

تھے مجلسی کے بعد یہ خضرِ رہِ طلب | جامِ جہاں نمائے روایاتِ دینِ رب
اسناد پوچھیے تو بتاتے تھے بے تعب | سطر و کتاب و صفحہ و راوی مع نسب

ہیں معترف فقیہ بھی اس کے ادیب بھی
تھا مستفیض سبطِ حسن سا خطیب بھی

...چشم و دماغ و گوش و زباں وقفِ علم و فن | جلوت میں گوشہ گیر تو خلوت میں انجمن
سینے میں ایک کوثرِ اخلاص موجزن | باتوں میں سلسبیل تو الفاظ میں لبن

خاکِ اودھ میں چشمۂ آبِ حیات تھے
طبعِ رواں کی موج میں گویا فرات تھے

...تھے باوجودِ سلطنتِ علم خاکسار | شکوہ نہ دوستوں سے نہ اعداء سے تھا غبار
...ہرِ گدا مجسمۂ خُلق و انکسار | اربابِ زر کی بزم میں خوددار و باوقار

عالم کی رفعتیں تھیں جبینِ نیاز میں
روح القدس کا فیض لباسِ مجاز میں

صورت میں وہ محاسنِ ساداتِ فاطمی | سیرت میں وہ مکارمِ اخلاقِ احمدی
...پرہیزگار و علم [illegible] تواضع سے تھا جلی | ہندوستاں کے آپ ہیں سلمانِ فارسی

۵ مولانائے مرحوم نے بارہا علماء و فضلاء و دیگر عمائدین لکھنؤ کی صحبت میں اس کا اعتراف فرمایا ۱۲

علم و عمل جو ساتھ ریاضت سمیت تھے
اک نقشِ پائے قافلۂ اہلبیتؑ تھے

زہد و ورع کا جامۂ پُرنور زیب تن
علم و عمل عبا و قبا۔ فضل پیرہن
پٹکا کمر کا عزمِ تاسیٔ پنجتنؑ
کفشوں میں پیروانِ یداللہ کا چلن

ترجیح تھی جو ذہن کو تیزی میں برق پر
پیچیدہ مسئلوں کا عمامہ تھا فرق پر

تھے تاجدارِ مملکتِ دینِ رب حضور
سکہ رواں تھا علم و عمل کا قریب و دور
پھیلا رہے تھے عالمِ غیبت میں حق کا نور
غائب جو تھا تو نائب کا تھا ظہور

جلوے سے اجتہاد کے روشن ضمیر تھے
بے نامہ و پیام خدا کے سفیر تھے

وہ خاندانِ پاک کہ یکتائے مشرقین
دادی بتول۔ احمدِ مرسل کے دل کا چین
دادا۔ جنابِ حیدرِ صفدر، شہِ حنین
وہ ناصرِ رسولؐ تھے یہ ناصرِ حسینؑ

اولاد تھے یہ عترتِ اطہار بھی نہ تھے
معصوم تو نہ تھے پہ گنہگار بھی نہ تھے

نام و نسب

اسلاف سے ملی تھی ہر اک علم کی سند
اقرار کر رہے ہیں مورخ بہ شد و مد
حامد سا باپ اور محمد قلی سا جد
دنیائے فضل میں یہ گھرانا ہے مستند

جس دودمانِ علم کی شہرت تھی دور دور
اس خاندان کو مایۂ صد ناز تھے حضور
ظاہر جبینِ پاک سے روحانیت کا نور
جس سے تھا صاف نسبتِ اسلاف کا ظہور

سرکارِ ناصری سے جنابِ امام تک
۲۹ سیڑھیاں ہیں امامت کے بام تک

حمزہ، جنابِ موسیٰ کاظمؑ کے تھے جو لال
جن میں تھی صفاتِ حضرت حمزہ کی چال ڈھال
الفت میں بے عدیل، مروت میں بے مثال
غربت میں بھی امامِ رضاؑ کے شریکِ حال

اولاد جن کی نسلِ رسالت پناہ ہے
یہ اُن کے نونہال ہیں۔ شجرہ گواہ ہے

جو نسل، خاندانِ رسالت ہے لاکلام
یہ بھی اُسی سپہر کے ہیں اک مہِ تمام
اسحاق نام۔ کنیت ابوالفضلِ نیک نام
ناصر حسین۔ ناصرِ ملت، خطابِ عام

طفلی ہی میں قبالۂ علم و ادب ملا
"صدر المحققین" پدر سے لقب ملا

تعلیم

تھا بچپنا شباب کی عظمت لیے ہوئے
غنچہ چمن کی روحِ لطافت لیے ہوئے
طفلی کمالِ فکر و بصیرت لیے ہوئے
ننھی سی جان، حد کی فضیلت لیے ہوئے

سرسبز کی جو گلشنِ تصنیف کی زمیں — "المفرد"[1] اس ریاض کا ثمرہ تھا اولیں

بحث یہ تھا کہ طاعتِ خالق بہ این الیقیں — سورہ ہے بعد حمد کے واجب بحکمِ دیں

یوں ابتدا ہوئی جو قلم کے جہاد کی

عباس[2] نے بھی دے دی سند اجتہاد کی

"اِسباغ"[3] اجتہادِ مسائل کی یادگار — تحقیق کا شباب، جوانی[4] کا شاہکار

ہے نو مجلدات میں دریائے بے کنار — یا اک فروغِ دیں کے گلستاں کی نو بہار

"اِسباغ" میں فتاویٔ شرعِ رسول ہیں

اس باغ میں ریاضِ پیمبر کے پھول ہیں

"اِنشائے فارسی" وہ مکاتیبِ علم و فن — ہیں فارس و عراق سے یہ جن کے ہم سخن

کیا کیا بیاں ہو اُن کی عبارت کا بانکپن — جیسے چمن میں بلبلِ شیراز نغمہ زن

بولی عجم کی لطفِ عرب کا لیے ہوئے

ہیں قندِ پارسی میں رُطب حل کیے ہوئے

گو فارسی خطوط کی ہر بات ہے نبات — کچھ اُس سے کم نہیں، عربی کی بھی "منشآت"[5]

الفاظ کا جہاں ہے معانی کی کائنات — زورِ قلم سے گرد ہے ہر اک موجۂ فرات

---

[1] "المفرد فی مسئلۃ وجوب السورۃ" اسی کتاب کی تصنیف کے بعد آپ کو سند اجتہاد عطا ہوئی ۱۲ [2] جناب مفتی محمد عباس صاحب قبلہ مرحوم اعلی اللہ مقامہ ۱۲ [3] "اسباغ النائل فی تحقیق المسائل" ۱۲ [4] یہ کتاب عالمِ جوانی میں تصنیف فرمائی ۱۲ [5] المنشآت العربیہ ۱۲

جولانیوں میں خامۂ نکتہ نواز کی

قلزم کا زور، شور، روانی جہاز کی

"دیوانِ شعر"[6] صیقلِ شاعری کی جان — باغِ قصائدِ عربی، غیرتِ جناں

اشعارِ فارسی کا چمن، رشکِ بوستاں — ہر شعر کی زمیں، تخیّل کا آسماں

جو کہہ دیا زباں سے وہ سب کو قبول ہے

یہ نائبِ امام، سخن کا رسول ہے

خطبوں کا "الخطب"[7] ہے وہ مجموعۂ عجیب — قائل ہیں جس کی شانِ فصاحت کے سب ادیب

معراجِ علم اُس کو نہ ہو کس لیے نصیب — جو منبرِ لسانِ الٰہی کا ہو خطیب

خطبے تمام، روحِ بلاغت لیے ہوئے

"ما ینطق"[8] کا زورِ خطابت لیے ہوئے

خُطبات ہیں کہ پند و نصائح کا اک چمن — جس کے گلوں سے سج کے خطابت بنی دلھن

مضمر ہر ایک نقطے میں ہیں نکتہ ہائے فن — جلدیں ہیں پانچ جن سے عیاں حُسنِ پنجتن

یہ وعظ کائناتِ حقیقت کا مول ہیں

گویا زبانِ مخبرِ صادق کے بول ہیں

مسند نشینِ علم کی "مسند"[9] کا کیا بیاں — جس کا ہے احترام خود اِسناد سے عیاں

ہیں اِس کتاب میں وہ احادیث بے گماں — جن کی جنابِ فاطمہ صغرا ہیں ترجماں

---

[6] "دیوان الشعر" جو کہ عربی و فارسی کے قصائد پر مشتمل ہے ۱۲ [9] "مسند فاطمہ بنت الحسین" ۱۲ [10] رسالتمآب ۱۲

اس کا مطالعہ بھی مگر فرضِ عین ہے
ناصر کو یہ عطیۂ بنتُ الحسینؑ ہے

ہے بزمِ علم میں "نفحات"[1] اپنی خود مثال — تحقیق و جستجو کے ہیں جس سے چمن نہال
ناصر حسین کی ہے یہ تصنیفِ لازوال — اِک دفترِ حدیث تو اک آیۂ کمال

اثنا عشر کا ذکر ہے شیریں زبان میں!
سولہ[2] مجلدات ہیں چودہؑ کی شان میں

اَنساب اک کتاب ہے فنِ رجال کی — تصنیف جو سلف کے ہیں اہلِ کمال کی
وہ الجھنیں ہیں اُس میں بیان و مقال کی — مشکل ہے جستجو کسی راوی کے حال کی

"فہرست"[3] جو بنائی ہے اس کی جناب نے
ناصر نے سعی کی ہے۔ مدد بوتراب نے

کیا عظمتیں "سبایکِ ذہبان"[4] کی ہوں رقم — فنِ رجال کا ہے جو مجموعۂ اہم
حیرت میں دیکھ کے ہیں سب عرب و عجم — دو کم پچاس جلدوں کا دفتر ہے یک قلم

کیوں اس قدر نہ ہوں یہ ثنا سا رجال کے
خود بھی ہیں مردِ عرصۂ علم و کمال کے

"اثباتِ ردِ شمس" کی تعریف ہے فضول — سورج کو ہے چراغ دکھانا بشر کی بھول
عقل اور نقل سے بفصاحت بغیر طول — روشن کیا ہے مرتبۂ نائبِ رسول

---

[1] نفحات الازہار فی مناقب الائمۃ الاطہار ۱۲ [2] ... [3] فہرست انساب سمعانی ۱۲ [4] سبایک الذہبان ۱۲

اس معجزے میں شان یہ ہے اس کتاب کی
جس طرح آفتاب دلیل آفتاب کی

کلثوم کے نکاح پہ تصنیفِ معتبر — "اِفحام"[1] ہے بسیط تو "النجعہ" مختصر
فاروقی صدق و کذب یہ دونوں ہیں منتظر — ناصر کی تیغ۔ حملۂ اغیار کی سپر

اعدا کی نیتوں کا نہ ظاہر خلل کیا
قولِ حسن سے عقد کے عُقدے کو حل کیا

حق سے جو شمعِ سعی و طلب کی لگی تھی لو — پھیلی تھی قصرِ علم میں ہر سو عمل کی ضو
ہوتی بقیس ماہ و سال تصانیف نو بہ نو — قرطاس پر قلم کا مسافر تھا تیز رو

اُس کے گلوں کو گننے کی کوشش فضول ہے
جس کے ریاض کا "عبقات"[2] ایک پھول ہے

عبقات پر ایک نظر

تھی ناتمام اِن کے پدر کی یہ اک کتاب — تحفے[3] کا شاہ جی کے جو ہے خلق میں جواب
ہے چونکہ اس میں بارہ حدیثوں[4] کا انتخاب — اثنا عشر سے یوں اسے حاصل ہے انتساب

جو بھی دلیل اِس میں ہے وہ لاجواب ہے
منسوخ[5] جو نہ ہوگی یہ ایسی کتاب ہے

---

[1] افحام الاعداء والخصوم فی عقد ام کلثوم ۱۲ [2] "عبقات الانوار" ۱۲ [3] تحفۂ اثنا عشریہ مصنفہ شاہ عبد العزیز ۱۲ [4] صاحب تحفہ نے بارہ احادیث صحیحہ سے انکار کیا ہے جو حضرت علیؑ کی شان میں مسلّمۂ فریقین ہیں "عبقات" میں انہی حدیثوں سے بحث کی گئی ہے ۱۲ [5] یہ نائبِ امام کی گویا کتاب ہے ۱۲

حیدر کے باب میں جو حدیثیں ہیں مستند ــ مُنکر ہے اُن کا صاحبِ تحفہ بلاسند
ایرادِ خصم حضرتِ حامد نے کر کے رد ــ دکھلائی ہے حدیثوں کی صحت بہ شدّ و مد

کیا کیا بیاں ہو کلکِ حقیقت رقم کا زور
ہے ضربِ حیدری کا نمونہ، قلم کا زور

لکھا وہ آب و تاب سے ذکرِ حدیثِ نور[2] ــ حرفوں کی روشنائی میں ہے روشنیٔ طور
ثابت یہ کر دیا ہے دلیلوں سے بے قصور ــ اک نور سے نبی و علی کا ہوا ظہور

یوں تجلّی ہے یہ نور کی مے ایک ایاغ سے
جیسے چراغ ہوتا ہے روشن چراغ سے

اس رنگ سے کیا ہے بیانِ حدیثِ طیر[3] ــ پروازِ فکر کی۔ نظر آتی ہے جس میں سیر
ہے دلپسندِ بلبلِ سدرہ یہ ذکرِ خیر ــ اُڑتا ہے مثلِ طائرِ آوارہ رنگِ غیر

ذکرِ حدیثِ طیر کی وہ آب و تاب ہے
سُن سُن کے دشمنوں کا کلیجہ کباب ہے

کیا مبحثِ حدیثِ ولایت[4] ہے بے نظیر ــ ظاہر ہے جس سے فضلِ شہنشاہِ دستگیر
کھینچا ہے کیا مرقّعِ ہنگامۂ غدیر ــ گویا بپا ہے جشنِ ولیعہدیٔ امیر

---

[1] فردوس آرامگاہ جناب مولوی حامد حسین صاحب قبلہ مرحوم اعلی اللہ مقامہ (جناب ناصر الملۃ کے والد) [2] حدیث رسالتمآبؐ کنت انا و علی بن ابی طالب نوراً بین یدی اللہ ۱۲ [3] جب فرشتہ جنت سے طائر بریشتہ لایا تو رسالتمآبؐ نے دعا کی اللہم ائتنی باحب الناس الیک یاکل معی ہذا الطیر فجاء علی ۱۲ [4] رسالتمآبؐ نے فرمایا ان علیاً منی و انا منہ و ہو ولی کل مومن بعدی ۱۲

حاضر ہیں غیرِ رنگِ پریدہ لیے ہوئے
حسّان جھومتے ہیں قصیدہ لیے ہوئے

تفصیل سے لکھی ہیں یہ بحثیں جو بے بدل ــ جلدیں ہیں سات، چار حدیثوں پہ مشتمل
کی ہے جو صرف، قوتِ تحقیق بر محل ــ مشکل کشا کے فیض سے عقدے کیے ہیں حل

علمی مناظرہ ہے مگر بے مزہ نہیں
روحانیت ضرور ہے گر معجزہ نہیں

کیا خوب خلق میں یہ ہدایت کا دور تھا ــ ذکرِ خصالِ شاہِ ولایت کا دور تھا
حامد کے بعد ناصرِ ملت کا دور تھا ــ وہ تھا مقامِ حمد۔ یہ نصرت کا دور تھا

والد کا نقشِ پا تھے سب انداز آپ کے
بیٹا وہ ہے قدم بقدم ہو جو باپ کے

ثابت کیا ہے لکھ کے عجب بحثِ لاجواب[1] ــ احمد ہیں شہرِ علم تو در ہیں ابوتراب
اس در سے دور تر ہے زمانے کا انقلاب ــ اُلٹے ہزار باب کو کوئی، رہے گا باب

ہمراہِ در جو شہر کا مذکور ہو گیا
یہ ذکرِ نور، نورِ علیٰ نور ہو گیا

ثابت حدیثِ باب سے کی مرتضیٰ کی شان ــ پھر بحثِ منزلت[2] میں دکھا دی ولا کی شان

---

[1] حدیث رسالتمآبؐ "انا مدینۃ العلم و علی بابہا" ۱۲ [2] رسالتمآبؐ نے حضرت علی سے فرمایا "اما ترضیٰ ان تکون منی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی" ۱۲

وہ دلنشیں ثبوت وہ دلکش ادا کی شان — جیسے ملک کے لب سے کلامِ خدا کی شان
منوا دیا کہ کیا ہے وصی کیا رسولؐ ہیں
ہارون ہیں علی بھی جو موسیٰ رسول ہیں

قیمت میں کائناتِ دو عالم سے ہے سوا — ذکرِ روایتِ ثقلین[1] گراں بہا
اس بحث میں ثبوت دیئے ہیں جو بے خطا — یہ فیض ہے تمسکِ قرآن و آل کا
بتلا رہی ہیں صاف دلیلیں کھلی ہوئی
کوثر سے ہے زبان، قلم کی، دھلی ہوئی

کیا خوب ہے روایتِ تشبیہ[2] کا بیاں - — یعنی ہر اک نبی کی علی میں ہے عزّ و شاں
آدم کے علم - نوح کے تقویٰ کا ہے نشاں — ہیبت کو پوچھیے تو یہ ہیں موسیٰ زماں
عیسیٰ سے آپ زہد و ورع میں جلیل ہیں
خُلّت کو دیکھنا ہو تو گویا خلیل ہیں

ہے ختم اس حدیث کا گو عالمِ مثال — کہتا ہے مدح خواں سہی مگر مقتضائے حال
چشمِ طلب سے دیکھ یداللہ کا جمال — قدرت کے ہیں نقوش محمدؐ کے خط و خال
جو چاہے کبریا و پیمبر کو دیکھ لے
بس اک نگاہِ شوق سے حیدرؑ کو دیکھ لے

---

[1] حدیث رسالتمآبؐ انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی، ما ان تمسکتم بہما لن تضلوا بعدی احدہما اعظم من الآخر ولن یفترقا حتی یردا علی الحوض ۱۲
[2] رسالتمآبؐ نے فرمایا "من اراد ان ینظر الی آدم فی علمہ والی نوح فی [illegible] والی ابراہیم فی حلمہ والی موسیٰ فی بطشہ والی عیسیٰ فی عبادتہ فلینظر الی علی بن ابی طالب" ۱۲

بے مثل ہر کتاب کہاں تک لکھوں صفات — ہر اک ورق میں ہیں عبقاتِ گلِ حیات
اس کے جو پندرہ ہیں مکمل مجلدات — نورِ نظر کے آٹھ ہیں اُن میں پدر کے سات
وہ ہفت چرخِ عظمتِ علم و کمال ہیں
یہ ہشت خلدِ فنِ حدیث و رجال ہیں

باقی ہے اب جو چار احادیث[1] کا بیاں — کامل نہ ہو یہ جزو تو کل کی ہے کسرِ شاں
ناصر کا علم و فضل تو سب پر ہوا عیاں — اب اُن کی تربیت کا ہے دنیا میں امتحاں
ہو جائے طے یہ راہ بھی فضلِ مجید سے
یہ امر کیا بعید ہے عزمِ سعید سے

یہ بھی اُسی فقیہ و محدّث کے ہیں خلف — قائل ہے جس کے علم کا ہر عالمِ نجف
مصر و عراق و شام میں شہرت ہے ہر طرف — فرخندہ ہو لکھنؤ، تجھے ناصر کا یہ شرف
چرچا ہے گوشے گوشے میں اس گوشہ گیر کا
سکہ رواں ہے شاہ و گدا میں فقیر کا

کتب خانہ

چھوڑا فیوضِ علم کا افسانہ یادگار — بے مثل و بے مثال کتب خانہ یادگار
اس سے سوا نہ قصر نہ کاشانہ یادگار — اسلام میں یہی تو ہے شاہانہ یادگار

---

[1] خصفِ نعل - حدیثِ رایت - حدیثِ حق - حدیثِ مناصبہ ۱۲

سرکارِ ناصری کی یہ کب بارگاہ ہو
اک مخزنِ علومِ رسالت پناہ ہو

وفات اور اس کے تاثرات

یہ بارگاہ جس میں ہیں پنہاں علومِ دیں — سونی پڑی ہے آج مثالِ دلِ حزیں
کیونکر نہ سر پہ خاک اڑائے یہ سرزمیں — مالی جو تھا چمن کا وہ ملتا نہیں کہیں

دھوکا ہر ایک کو یہ ہے شمعِ مزار کا
ناصرؔ یہ تھا مدار اودھ کی بہار کا

تابوت کی آگرے کو روانگی

جاتی ہے آگرے کو جو میت حضور کی — اہلِ وطن پہ شاق ہو فرقت حضور کی
پر کیا کریں یہی تھی وصیت حضور کی — پہلو میں ہو شہید[1] کے تربت حضور کی

ظاہر جہاں پہ ربطِ نہاں کا کمال ہو
مرنے کے بعد علم و عمل کا وصال ہو

ممکن نہ تھا جو پاسِ وصیت دمِ محن — کچھ روز نعشِ پاک رہی زینتِ وطن
مصروفِ سازِ دفن تھی ملت کے مرد و زن — جزداں میں تھی کتاب کہ لاشہ تہِ کفن

رکھا رہا امانتِ شاہِ ہدا میں جسم
واں تھی نجف میں روح یہاں کربلا میں جسم

---

[1] شہید آگرہ قاضی نور اللہ شوستری شہید ثالث ۱۲ [2] غسل و کفن کے بعد مرحوم کا تابوت کربلا [illegible]

تنظیمِ باہمی کی معلم جو تھی حیات — ملت کے اجتماع کا مرکز بنی وفات
وہ آخری جلوس وہ قومی تاثرات — لپٹی ہوئی کفن میں شریعت کی کائنات

تھا امتحانِ ضبط۔ دلِ زار کے لیے
مضطر تھی قوم آخری دیدار کے لیے

وہ ازدحامِ اہلِ عقیدت وہ کربلا — کرب و بلا میں مجلسِ ماتم وہ اک بپا
روتے تھے سر کو پیٹ کے یوں صاحبِ عزا — جیسے کہ روزِ خاص یہی ہے وفات کا

دل کہہ رہا تھا دیکھ کے اس شور و شین کو
یہ دوست واں کہاں تھی جو روتے حسینؑ کو

اک شور تھا کہ قوم کے سردار الوداع — اے دینِ حق کے محرمِ اسرار الوداع
اے کاروانِ علم کے سالار الوداع — اے جاں نثارِ عترتِ اطہار الوداع

اہلِ عزا بھی ساتھ بصد شور و شین ہیں
حافظ خدائے پاک ہے۔ ناصرِ حسینؑ ہیں

پہلے سے تھی جو دفن کی ہندوستاں میں دھوم — افرادِ قوم آئے تھے شرکت کو بالعموم
تھا کربلا میں رخصتِ میت پہ وہ ہجوم — گویا کہ آسماں سے اتر آئے تھے نجوم

میت تھی آگرے کو رواں کس حشم کے ساتھ
اک فوج تھی مسافرِ راہِ عدم کے ساتھ

وہ نوحہ گر ہجوم کہ طوفانِ پُر خروش — ماتم کا شور گریہ و آہ و بکا کا جوش

سرکارِ ناصری کی یہ کب بارگاہ ہو
اک مخزنِ علومِ رسالت پناہ ہو

وفات اور اس کے تاثرات

یہ بارگاہ جس میں ہیں پنہاں علوم دیں — سونی پڑی ہے آج مثالِ دلِ حزیں
کیونکر نہ سر پہ خاک اڑائے یہ سرزمیں — مالی جو تھا چمن کا وہ ملتا نہیں کہیں

دھوکا ہر ایک گل پہ ہے شمعِ مزار کا
ناصر یہ تھا مدار اودھ کی بہار کا

تابوت کی آگرے کو روانگی

جاتی ہے آگرے کو جو میت حضور کی — اہلِ وطن پہ شاق ہو فرقت حضور کی
پر کیا کریں یہی تھی وصیت حضور کی — پہلو میں ہو شہید[1] کے تربت حضور کی

ظاہر جہاں پہ ربطِ نہاں کا کمال ہو
مرنے کے بعد علم و عمل کا وصال ہو

ممکن نہ تھا جو پاسِ وصیت و مِحَن — کچھ روز نعشِ پاک رہی زینتِ وطن
مصروفِ سازِ دفن تھی ملت کے مرد و زن — جُز داں میں تھی کتاب کہ لاشہ تہِ کفن

رکھا رہا امانتِ شاہِ ہدا میں جسم
واں تھی نجف میں روح یہاں کربلا[2] میں جسم

---

[1] شہیدِ آگرہ قاضی نور اللہ شوشتری شہیدِ ثالث ۱۲ [2] غسل و کفن کے بعد مرحوم کا تابوت کربلا [illegible]

تنظیمِ باہمی کی مُعلّم جو تھی حیات — ملت کے اجتماع کا مرکز بنی وفات
وہ آخری جلوس وہ قومی تاثرات — لپٹی ہوئی کفن میں شریعت کی کائنات

تھا امتحانِ ضبط۔ دلِ زار کے لیے
مضطر تھی قوم آخری دیدار کے لیے

وہ اژدحامِ اہلِ عقیدت وہ کربلا — کرب و بلا میں مجلسِ ماتم وہ اک بپا
روتے تھے سر کو پیٹ کے یوں صاحبِ عزا — جیسے کہ روزِ خاص یہی ہے وفات کا

دل کہہ رہا تھا دیکھ کے اس شور و شین کو
یہ دوست واں کہاں تھی جو روتے حسینؑ کو

اک شور تھا کہ قوم کے سردار الوداع — اے دینِ حق کے محرمِ اسرار الوداع
اے کاروانِ علم کے سالار الوداع — اے جاں نثارِ عترتِ اطہار الوداع

اہلِ عزا بھی ساتھ بصد شور و شین ہیں
حافظ خدائے پاک ہے۔ ناصر حسینؑ ہیں

پہلے سے تھی جو دفن کی ہندوستاں میں دھوم — افرادِ قوم آئے تھے شرکت کو بالعموم
تھا کربلا میں رخصتِ میت پہ وہ ہجوم — گویا کہ آسماں سے اتر آئے تھے نجوم

میت تھی آگرے کو رواں کس حشم کے ساتھ
اک فوج تھی مسافرِ راہِ عدم کے ساتھ

وہ نوحہ گر ہجوم کہ طوفانِ پُر خروش — ماتم کا شور، گریہ و آہ و بکا کا جوش

وہ نعشِ پاک اہلِ عقیدت کے زیبِ دوش
تابوت مثلِ خانۂ کعبہ سیاہ پوش
سبقت کو پاؤں اٹھتا تھا ہر ذی شعور کا
بوذر کی لاش تھی کہ جنازہ حضور کا

تابوت کے جلوس میں شامل تھے صف بہ صف
حکامِ باوقار و امیرانِ ذی شرف
اُس وقت لکھنؤ پہ گماں تھا کہ ہے نجف
اربابِ علم و فضل کے جگھٹ تھے ہر طرف
جانِ عمل کی نعش تھی ملت کے دوش پر
پروانوں کا ہجوم تھا شمعِ خموش پر

کاندھے پہ یوں لیے تھے جنازے کو اہلِ درد
جیسے ہوا کے دوش پہ نکہت ہو رہ نورد
شوریدہ حال یوں تھے عقب میں بآہِ سرد
جیسے کہ شہسوار کے پیچھے رواں ہو گرد
علم و عمل کا چاند جو برجِ فنا میں تھا
وا ناصرا کا شور جلوسِ عزا میں تھا

افرادِ قوم صدمۂ فرقت لیے ہوئے
اہلِ ولا دلوں میں عقیدت لیے ہوئے
اربابِ فضل۔ علم کی میت لیے ہوئے
قولِ نبیؐ۔ نویدِ شہادت لیے ہوئے
من مات[1] کی حدیث تھی زیورِ ممات کا
خود موت لے کے آئی تھی خلعت حیات کا

اللہ رے جنازۂ ناصرِ عزوجاہ
میت تھی زیبِ دوش کہ تختِ روانِ شاہ

[1] حدیث رسالتمآبؐ من مات فی طلب العلم فقد مات شہیدا ۱۲

تھی خضرِ کاروانِ عزا رحمتِ الٰہ
اشکوں کی طرح قوم کی آنکھیں تھیں فرشِ راہ
آتی تھی ہر قدم پہ صدا شیخ و شاب کی
جاتی ہے آگرے کو سواری جناب کی

اس شوکت و شکوہ سے تابوتِ محترم
سرحد میں چارباغ[1] کی پہونچا بصد حشم
وہ بھیڑ تھی کہ بند ہوا تھا ہوا کا دم
پرچم تھے آنسوؤں کے تو آہوں کے تھے علم
آساں سمجھ رہے تھے جو الفت کے کھیل کو
روئے تڑپ کے سونپی امانت جو ریل کو

حسرت سے کہہ رہے تھے یہ آپس میں اہلِ دیں
قاضی[2] کے پاس جاتا ہے مفتیِ بالیقیں
اتنا تو حسنِ دوست کا ہو جذبِ دلنشیں
طالب کو بعدِ مرگ بھی حاصل سکون نہیں
اب لکھنؤ سے رخصتِ فصلِ بہار ہے
عاشق کی نعش رہ سپرِ کوئے یار ہے

ناگاہ لکھنؤ سے جنازہ ہوا رواں
راہی ہوئے سب اہلِ ولا بھی بصد فغاں
بھولے گا عمر بھر نہ غم انگیز وہ سماں
ہلتی تھی ریل شور سے نالوں کے الاماں
واللہ خوب حقِ عقیدت ادا کیے
منزل[3] تک اہلِ قافلہ قرآں پڑھا کیے

[1] لکھنؤ کے اسٹیشن کا نام ۱۲ [2] شہید آگرہ قاضی نور اللہ شوستری [3] آگرہ ۱۲

خاکِ اودھ سے تا بمزارِ شہیدِ غم — گزرے جدھر جدھر سے مسافر...
تھا طالبانِ دید کا مجمع قدم قدم — کیں دعوتیں[1] بھی اہلِ ولا نے...

سب فیض تھا یہ نائبِ شاہِ امام کا
لشکر تھا ساتھ ساتھ درود و سلام کا

تابوت پر تھی سایہ فگن رحمتِ ودود — ناگاہ آگرے کی تجلّی ہوئی...
قوم و وطن کا فخر جو ناصر کا تھا وجود — سب منتظر تھے مسلم و عیسائی...

جو حالت اپنی قوم کی ہوتی وہ ٹھیک تھی
یاں جو بھی قوم تھی وہ عزا میں شریک تھی

شرکت کو دور دور سے آئے تھے خوش سیر — حاضر تھے سب اٹھانے کو لاشہ...
شانے سے شانہ چھلتا تھا مجمع تھا اس قدر — پہلو میں تھے عوام کے اشخاصِ معتب...

منظر تھا حجِ بیتِ خدائے قدیر کا
احساس مٹ گیا تھا غریب امیر کا

تابوت میہماں کا اٹھائے بہ کرّ و فر — سب صورتِ جلوسِ محرّم تھے نوحہ...
ناصر کی لاش آئی جو قبرِ شہید پر — غُل پڑ گیا کہ قلب کے پہلو میں ہے...

---

[1] اہلِ کانپور نے اسٹیشن پر شاندار دعوت کی پھر حضرات فیروزآباد حصولِ سعادت کے منتظر تھے مگر تابوت مقررہ گاڑی... نہ پہنچ سکا۔ بعد کی گاڑی کا وہاں ٹھہرنا ممکن نہ تھا اس لیے مومنین نے ٹونڈلہ پہنچ کر فرائضِ میزبانی انجام دیے...

نعشِ فقیہ سرحدِ قاضی میں آئی ہے
یہ نورؔ[1] کی کشش ہے جو یاں کھینچ لائی ہے

قاضی نوراللہ شوستری

وہ نور جس کی ذات تعارف سے بے نیاز — جو مادی وجود میں روحانیت نواز
اِس عالمِ مجاز میں بیگانۂ مجاز — شانِ قضا یہ جس کی قضا و قدر کو ناز

خود مرشدِ جہاں بھی، علیؑ کا مرید بھی
زندہ بھی اور راہِ خدا کا شہید بھی

توہین جس کی، عزت و توقیر کی گواہ — تخریب جس کی خلق میں تعمیر کی گواہ
تاریخ جس کے عزمِ جہانگیر کی گواہ — ہر موجِ خوں تاسّیِ شبیرؑ کی گواہ

یہ شانِ صدق سطوتِ خود سر کے سامنے
چلتی رہی زباں دمِ خنجر کے سامنے

نورانیت کے حسن سے نکھری ہوئی حیات — نورِ الٰہ، نورِ جہاں، نورِ کائنات
تابانیوں سے جس کی منوّر اجل کی رات — ہر قطرہ جس کے خوں کا صداقت کی اک فرات

جو وجد میں تھا جامِ شہادت پیے ہوئے
سر پر حسینیت کا پھریرا لیے ہوئے

رہرو بہت ہیں یوں تو شہادت کی راہ میں — یہ منفرد ہے الفتِ عترت کی راہ میں

---

[1] قاضی نوراللہ شوستری کی طرف نہایت لطیف اشارہ ہے ۱۲

ثابت قدم رہا جو حقیقت کی راہ میں
کانپا نہ پائے عزم صداقت کی راہ میں
سر کو جھکا کے مرضیِ مولا میں جان دی
ہے آگرہ گواہ، کہ حق کو زبان دی

آگرے کی عظمت

اے آگرے کی خاک حریمِ وفا ہے تو
راہِ طلب میں جادۂ وحدت نما ہے تو
قبرِ شہید و مشہدِ صبر و رضا ہے تو
ہندوستاں کی گود میں اک کربلا[1] ہے تو
چشمہ اُبل رہا ہے جو عزمِ حیات کا
جمنا میں کوئی سوت ہے شاید فرات کا
یوں تو یہ خاکِ پاک ہے شاہوں کی تخت گاہ
سوتے ہیں اس کی گود میں ماضی کے بادشاہ
ذرہ نواز ہے بخدا رحمتِ الٰہ
بخشے زمیں کو قاضی و ناصر سے مہر و ماہ
ذروں پہ آگرے کے تصدق ہزار چاند
دو چاند وہ ملے کہ لگے جن سے چار چاند
کیونکر نہ اپنے اوج پہ نازاں ہو یہ زمیں
ہے کائناتِ علم و عمل جلوہ گر یہیں
پہلے تو ایک روحِ شہادت تھی جاگزیں
اب دوسرا بھی شاہدِ عادل ہوا مکیں
طوفانِ عشق حسن کی موجوں میں کھو گیا
جمنا پہ آج مجمعِ بحرین ہو گیا

[1] اس مصرع کے بعد بیت کہنا اور اس میں مزید لطف پیدا کر دینا کمالِ شاعری ہے ۱۲

ہے آگرے پہ خاص کرم مصطفین[1] کا
آیا سمٹ کے نور یہاں مشرقین کا
یہ نور کا مزار وہ ناصر حسین کا
اس برج میں قران ہوا نیرین کا
منزل جو مہر و ماہ کی یہ خاک ہو گئی
کل سرزمین ہمسرِ افلاک ہو گئی

تاریخِ وفات و تاریخِ دفن

ناصر کی لاش لے کے جو آئے ہیں جاں نثار
ہاتف بھی ہے مزار پہ قاضی کے اشکبار
مصرع یہ سالِ مرگ کا پڑھتا ہے بار بار
ہیں علم و زہد ناصرِ ملت کے سوگوار
۱۳۶۱ھ

تاریخِ دفن بھی یہ عجب دلخراش ہے
وہ نور کے مزار میں ناصر کی لاش ہے
۱۳۶۲ھ

دفن

ہاتف کا وہ بیاں وہ مجبوں کی یہ صدا
وا ناصراہ وا اسفا وا مصیبتا
آیا تھا جب سے روضے پہ تابوت آپ کا
ماتم کبھی تھا اور کبھی مجلسیں بپا
روتے تھے مومنین مزارِ شہید میں
لاشہ فقیہ کا تھا کنارِ شہید میں
ناگاہ سر کو پیٹتے اٹھے جگر کباب
آیا گہن میں قبر کے ملت کا آفتاب
مٹی میں چھپ گیا جو غلامِ ابوتراب
آئی ندا کہ کھول دو خلدِ بریں کا باب

[1] دو برگزیدہ ہستیاں رسالتمآب اور حضرت علیؑ۔ یہاں شہید و فقیہ کی مناسبت بھی ظاہر ہے ۱۲

چشمِ کرم ہے فاطمہ کے نورِ عین کی
ناصرؔ ہے اس زمیں میں امانت حسینؑ کی

لکھنؤ کا پیغام آگرے کے نام

آتی تھی لکھنؤ کی یہ آواز دردناک — تجھ پر مرا سلام ہو اے آگرے کی خاک
چھٹتی ہے ہم سے ناصرِ ملت کی ذاتِ پاک — ملتی ہے تجھکو دولتِ دیں سے وہ خانداک

دونوں جہاں کی تجھکو سعادت حصول ہو
یہ لکھنؤ کا تحفۂ علمی قبول ہو

جس پر ہمیں تھا ناز وہ دولت نہیں رہی — وہ لکھنؤ کی شان وہ شوکت نہیں رہی
ناصرؔ کے بعد زیست کی صورت نہیں رہی — شامِ اودھ کی شمعِ ہدایت نہیں رہی

تنہا نہ یاں سے لاشۂ جانِ عمل گیا
علم و کمال کا بھی جنازہ نکل گیا

بچھڑا وہ ہم سے جس پہ ہمیں افتخار تھا — اس دور میں علوم کا دار و مدار تھا
تو نے چنا وہ پھول کہ جانِ بہار تھا — مانندِ ماہ عابدِ شب زندہ دار تھا

اتنا رہے خیال کہ مسکن سے دور ہے
اے خاکِ پاک، خاطرِ مہماں ضرور ہے

خوابیدہ تیری گود میں عظمت ہے قوم کی — تو سر چڑھا اسے کہ یہ عزت ہے قوم کی
اے آگرے۔ یہ تجھ سے وصیت ہے قوم کی — رکھنا سنبھال کر، یہ امانت ہے قوم کی

روشن رہے چراغ دلِ داغدار کا
سونپا تجھے مزار غریب الدیار کا

تو ناشناسِ رتبۂ اہلِ وفا نہیں — کوفہ نہیں۔ دمشق نہیں۔ کربلا نہیں
ہرگز یہاں کسی کا بھرا گھر لٹا نہیں — بے شیر کا لہو کبھی تجھ پہ بہا نہیں

جمنا پہ کوئی ذبح کہاں تشنہ لب ہوا
لاشہ ترے شہید[1] کا پامال کب ہوا

لوٹی گئی نہ تجھ پہ کسی کی حرم سرا — تو نے کسی مریض کو قیدی نہیں کیا
بے وارثوں کے سر سے نہ تجھ پہ چھنی ردا — مہماں بلا کے تو نے کسی سے نہ کی دغا

اس وقت یاد آ گئی ناچاری حسینؑ
فریاد از غریبی و بے یاریِ حسینؑ

وہ بھوک پیاس اور وہ شیرِ خدا کے لال — دم توڑتے تھے ماؤں کی گودی میں نونہال
رو رو کے آب مانگ رہے تھے جو خورد سال — پانی دکھا دکھا کے بہاتے تھے بد خصال

عترت جو تھی امام مدینہ کے ساتھ ہیں
اصغر بھی تشنہ لب تھے سکینہ کے ساتھ ہیں

تیغوں پہ تیغیں بھوک میں کھاتے رہے حسینؑ — پی پی کے اشک پیاس بجھاتے رہے حسینؑ
پیاروں کے داغ دل پہ اٹھاتے رہے حسینؑ — راہِ خدا میں گھر کو لٹاتے رہے حسینؑ

[1] قاضی نور اللہ شوستری ۱۲

تا عصر مرنے والوں کی خدمت کیے گئے
یہ لاش اٹھا کے لائے تو وہ لاش دے گئے

اس بیکسی میں پیاس ستاتی جو تھی سوا
"ہَل مِن مُغِیث" کہتے تھے مظلوم کربلا
سن سن کے استغاثۂ شبیرؑ کی صدا
رہ جاتے تھے تڑپ کے شہیدانِ باوفا
کوئی نہ تھا جو بھائی کی نصرت کے واسطے
بیچین تھی بہن بھی حمایت کے واسطے

باد ردو آہ کہتے تھے جبریلِ نیکنام
مولا مدد کے واسطے حاضر ہے یہ غلام
پیاسے کنارِ نہر رہیں کیوں شہِ انام
یہ تو ہے مہرِ[1] آپ کی مادر کا یا امام
پانی ہیں لاؤں۔ پیاس شہِ دیں بجھائینگے
فرمایا ہاں پئیں گے جو عباسؑ لائینگے

اب کیا پئینگے پانی کہ بھائی گزر گئے
اکبر ہمیں بڑھاپے میں برباد کر گئے
قاسم کہاں ہیں عونؑ محمدؑ کدھر گئے
اس کے پئیے تڑپ کے مرے لال مر گئے
کچھ لطف زندگی نہیں اب کیا جئیں حسینؑ
اصغر کو بھول جائے تو پانی پئیے حسینؑ

بس اے نسیم گلشنِ پیغمبرِ حجاز
اس تیرے مرثیے پہ ہے اردو زباں کو ناز
وہ بزم آج تو نے سجی ہے ادب نواز
جس میں وقارِ قوم و وطن کے نہاں ہیں راز

---

[1] مالک کائنات کے حکم سے دنیا کا تمام آبِ نمک جناب سیدہ کے مہر میں ہے ۱۲

علم و عمل کا ذکر جو بعد از وفات ہے
اخلاف کے لیئے۔ یہ پیام حیات ہے

اس شان سے سوائے شہیدانِ حق پناہ
کس کے لکھے گئے ہیں مراثی بعز و جاہ
ناصر کے فیض سے وہ بنی آج شاہراہ
جس پر چلیں گے بعد میں ارباب دستگاہ
یہ کیا ہے پھر جو تجھ پہ عطائے خدا نہیں
اب تک کسی نے مرثیہ[1] ایسا کہا نہیں

ختمِ کلام پر ہے مروت کا مقتضا
رحمت[2] کا اس محل پہ کروں شکریہ ادا
وہ حسبِ حال[3] چاہتے تھے نظمِ بے بہا
میں نے بجائے نظم کے یہ مرثیہ کہا
تحریک اُن کی، عزمِ سخن میں شمول ہے
یہ اِس کلامِ درد کی شانِ نزول ہے

---
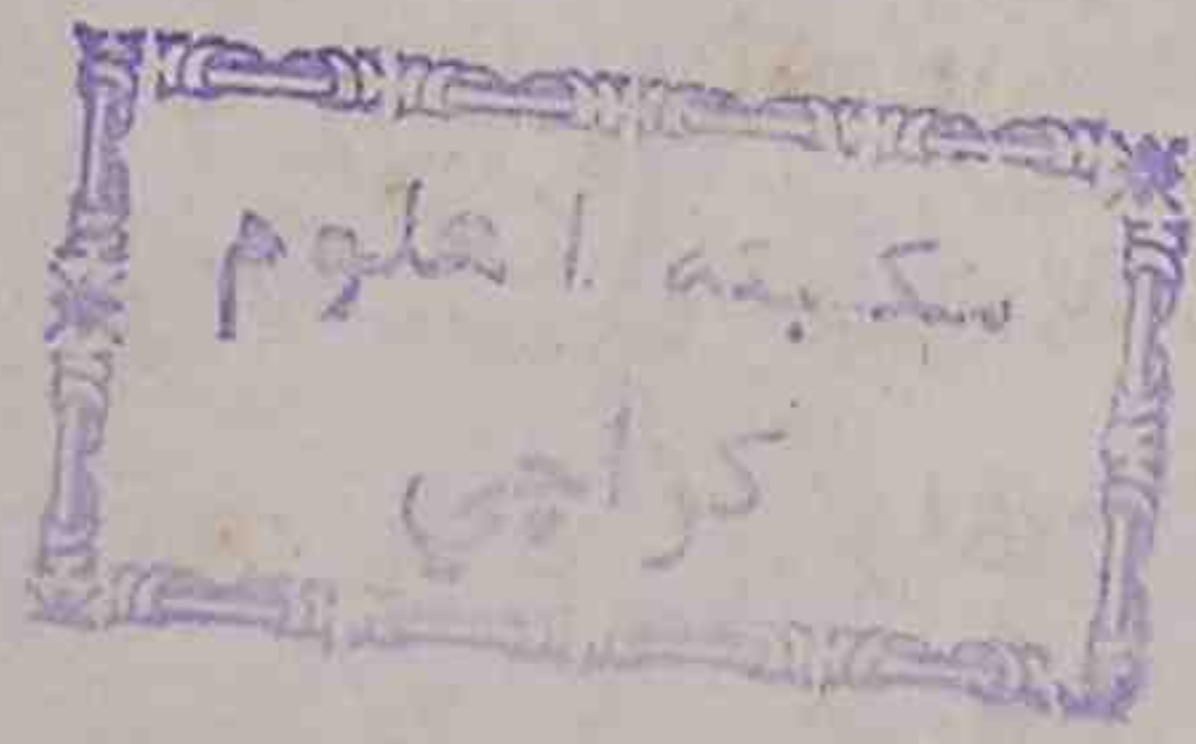
[1] علماء اور مشاہیرِ عالم کے حال میں اتنا مفصل اور مکمل مرثیہ اردو زبان میں زیرِ نظر مرثیہ سے پہلے نہیں کہا گیا ۱۲ [2] اخبار وثیقہ دار لکھنؤ کے اڈیٹر جن کا "ناصر الملۃ نمبر" اور "وداع ناصر نمبر" علم و ادب کی دنیا میں یادگار ہے ۱۲ [3] "وداع ناصر نمبر" کے لیے ۱۲